www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

نومبر 2018

Mahnama Khawateen Duniya Monthly November 2018, Vol. 02, Issue: 11 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
National Council for Promotion of Urdu Language **ISSN 2581-4826**
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	مالوہ کی شاعرہ: مہر النساء مہر زریں	ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار	ادارہ	8
جہان نسواں	اُردو زبان و ادب کی تعلیم اور خواتین	عمرانہ خاتون	9
	جدید اردو شاعری میں تانیثیت	پروفیسر توقیر عالم	12
	اردو اسکولوں میں سائنس: نصاب اور تعلیم	نفیس بانو ہاشمی	16
	مرزا غالب: ایک منفرد شاعر	رضیہ پروین	18
	عصمت چغتائی 'چوتھی کا جوڑا' کے آئینے میں	غزالہ فاطمہ	21
	قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں............	نور الصباح	25
	اردو کی اولین نسائی آواز: رشیدۃ النساء بیگم	رخسار پروین	31
کہانیاں	یار	عصمت چغتائی	35
	راز	وفا یزداں	39
	قطرہ قطرہ دریا ہوتا ہے	زیب النساء حیا	42
	دیوی	شمس الہدیٰ انصاری	44
	بلاعنوان	سفینہ بیگم	47
	چوڑیاں چوھاتی ہیں	صبا نسیم	50
حسن سخن	عزیز بانو داراب وفا، نور جہاں ثروت، پروین شاکر، انجم رہبر ڈاکٹر رؤف خیر، ہاجرہ نور زریاب		52
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		55
صحت	حمل کے زمانہ میں قبض: اسباب اور علاج	ڈاکٹر احسان رؤف	57
آرائش و زیبائش	ہم کیوں پہنیں زیورات؟	ایس۔اے۔ساگر	59
تاثرات	نگر نگر سے		61

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 2 شمارہ: 11 نومبر 2018

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746 فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

قومی اردو کونسل اردو زبان کو فروغ دینے میں ہمیشہ کوشاں رہی ہے۔ اپنے رسائل اردو دنیا، فکر و تحقیق، بچوں کی دنیا اور خواتین دنیا کے ذریعہ فروغ اردو زبان کے مشن میں انہماک سے سرگرم ہے۔ ماہنامہ خواتین دنیا نے ایک سال کے مختصر وقفہ میں نسائی طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے ادبی دنیا میں الگ شناخت بنائی ہے۔ قلم کاروں کی قابل قدر نگارشات اور قارئین کے قیمتی مشوروں نے اس رسالے کو بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔ یہ رسالہ خواتین کی زندگی کے ہر پہلو سے جڑا ہے اس لیے گھر کے دسترخوان سے لے کر ادبی میدان تک خواتین کی مسلسل کاوشوں اور حصہ داری کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش میں اس رسالے نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ خواتین دنیا کی اشاعت نے خواتین اور خواتین کے مسائل پر قلم اٹھانے والوں کو ایک ایسا موقع فراہم کیا جس کے سبب کئی قلمکاروں کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع ملا نئے لکھنے والوں نے بھی اس موقع کا فائدہ خوب اٹھایا اور اسے مقبولِ عام بنانے میں مدد کی نتیجتاً خواتین دنیا اپنی انفرادیت اور وقار و معیار کے سبب دنیا بھر میں مقبول ہو گیا ہے اور کیوں نہ ہو اس رسالے میں دلچسپ اور معلوماتی مضامین جو شامل ہیں۔ خواتین دنیا کے مشمولات کو بڑا کینوس دیا گیا ہے۔ جس میں موجودہ دور کے مختلف میدانوں میں خواتین کی علمی و ادبی خدمات، ان کے تجربات و مشاہدات کو منظر عام پر لانے کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔

ادب، ثقافت، آرٹ یا موسیقی زندگی کے ہم راہ چلتے ہیں اور ان کا مقصد معاشرہ اور اس میں بسنے والے لوگوں کو پر مسرت زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانا ہے۔ صنفی و نسلی امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر محبت کا پیغام عام کرنا ہی ادب کا مقصد ہے ادب کے اس مقصد کی تکمیل میں خواتین دنیا اہم رول ادا کر رہا ہے۔ بلاشبہ خواتین دنیا ایک ایسا پلیٹ فارم بن گیا ہے جہاں خواتین سے جڑے مسائل پر کھل کر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمیں ابھی اور آگے بڑھنے کی ضرورت ہے نہ صرف مسائل پر گفتگو کرنی ہے بلکہ ان مسائل کے حل بھی تلاش کرنے ہیں۔ کیونکہ حقوق نسواں کے نعرے یا مسائل پر صرف آواز بلند نہیں کرنی ہے۔ بلکہ عملی اقدام بھی بے حد ضروری ہیں تاکہ نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دنیا میں موجود خواتین کے ایثار و عزم اور ان کی ہمت کو داد شجاعت دے سکیں۔

ادب میں جس گہرائی و گیرائی نیز تجربے کی ضرورت ہوتی ہے وہ خواتین میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے ہماری خواتین کو اپنے مشاہدے کو بروئے کار لا کر تخلیقی سرمائے کو اور وقیع کرنا چاہیے تاکہ دنیا کے ہر ملک کی عورت آپ کی آرا کو نشانِ منزل بنائے جس سے ایک صحت مند معاشرے کی از سر نو تشکیل ہو۔ میری درخواست اور خواہش ہے کہ خواتین اپنے ماحول، مسائل، ترقی کی راہ میں حائل پریشانیاں اور نابرابری جیسی برائیوں کو ختم کرنے کی سبیل تلاش کریں اور ان کو تحریری شکل دے کر دنیا تک پہنچائیں۔ اس پلیٹ فارم کو وسیع سے وسیع تر کرنے اور عروج کی منزلوں تک پہنچانے میں آپ کے تعاون کی انتہائی ضرورت ہے۔ ہمیں ایسی تخلیقات پیش کرنی ہیں جو خواتین کے مسائل، ان کے مزاج کو مدنظر رکھ کر لکھی جائیں جس سے فکر و عمل کے دروازے بھی کھلیں اور نئی منزلیں خوشگوار ماحول کی بنیاد بنے۔

یہ بات باعث فخر ہے کہ خواتین دنیا کی معنوی اور صوری خوبصورتی کی تعریف ہمیں تاثرات کی صورت میں ملتی رہی ہے۔ قارئین نے جہاں مضامین، کہانیاں، جہانِ نسواں کو سراہا ہے وہیں رسالے کی آرائش و زیبائش سے بھی کافی متاثر ہوئے ہیں۔ خواتین دنیا کو آگے بڑھانے میں قارئین نے اہم رول ادا کیا ہے۔ گذشتہ چند مہینوں میں اس رسالے میں اردو کی اہم شخصیات پر انٹرویو بھی شائع ہوئے ہیں جسے قارئین نے سراہا اور پسند کیا۔ خواتین دنیا کی اشاعت کا مقصد سیاسی، سماجی، معاشی و اقتصادی اور تعلیمی تناظر میں خواتین کی ذہنی اور تخلیقی قوتوں کو باہر لانا ہے تاکہ وہ اپنے احساسات و جذبات کا برملا اظہار کر کے معاشرہ کو اپنے مسائل سے آگاہ کریں اور آج خواتین دنیا اس مقصد میں کامیابی کی راہیں طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسی طرح آگے بڑھتا رہے گا۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی

مالوہ کی شاعرہ: مہرالنساء مہؔر زریں

دل کی آواز سُن رہا ہوں میں
یا مجھے آپ نے پکارا ہے

سیدھے سادے الفاظ میں دل کے تاروں کو جھنجھوڑنے والے اس شعر کا خالق کوئی مرد نہیں ہے بلکہ مدھیہ پردیش کے مشہور صنعتی شہر اندور کی نواحی بستی مہو(MHOW) کی شاعرہ مہرالنساء مہر زریں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ صدی کی ابتدائی کئی دہائیوں تک خواتین کے لیے بہار یہ شعر و شاعری انتہائی ناپسندیدہ فعل تصور کیا جاتا تھا لہٰذا اکثر شاعرات اپنی شاعری کو عموماً حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، سلام، رخصتی وغیرہ تک محدود رکھتی تھیں اور بہاریہ غزلیات میں نسائی لہجہ کے بجائے مردانہ لہجہ اختیار کرتی تھیں۔ اندور سے محض 22 رکلومیٹر دوری پر واقع قدرتی حُسن اور لطیف آب و ہوا سے مالامال علاقہ کو انگریز حکمرانوں نے 1821 میں اپنی فوجی چھاؤنی قائم کرنے کے لیے منتخب کیا تھا اور اس کا نام ملٹری ہیڈ کوارٹر آف وار یا مہو(MHOW) رکھا تھا۔ اس وقت اندور سمیت مالوہ کا پورا علاقہ اُردو شعر و ادب کا مرکز بن چکا تھا۔ چونکہ انگریزی فوج میں بڑی تعداد میں وہ ہندوستانی سپاہی تھے جن کی مادری زبان اُردو تھی اس لیے مہو میں فوجی چھاؤنی قائم ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی شعر و ادب کی فضا بھی قائم ہوگئی تھی۔ اسی لیے 15/ مارچ 1933 کو حکیم عبدالکریم کے ادب نواز گھرانے میں پیدا ہونے والی مہر النساء کو ابتدا سے ہی بڑا سازگار ادبی ماحول ملا۔ لہٰذا 14/ برس کی عمر میں شادی ہوجانے پر بھی وہ شیخ سعدی کی گلستاں و بوستاں کی فارسی حکایات، حالی کی مسدس اور مرزا غالب و علامہ اقبال وغیرہ کے کلام سے کماحقہٗ واقف ہوچکی تھیں۔ شادی کے تھوڑے عرصہ بعد ہی 1947 میں ملک کی تقسیم کی وجہ سے اُن کو اپنے شوہر کے ساتھ مجبوراً نقل مکانی کرنا پڑی لیکن اسلامی مملکت کہلانے والے ملک میں مہاجرین کے ساتھ کیے جانے والے سوتیلے برتاؤ اور ناگزیر حالات سے تنگ آکر اُن کو 1948 میں اپنے وطن واپس ہونا پڑا۔ تقسیم کے اندوہناک واقعات اور خود پر گزرنے والے مصائب نے اُن کے اندر خاموش دبے پڑے شاعر کو باہر نکال کر گویائی کے لیے مجبور کیا۔ شاعری کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور جامعہ اُردو علی گڑھ کے امتحانات پاس کیے جن کی بدولت اُن کا تقرر مقامی کنٹونمنٹ پرائمری اسکول میں اُردو معلّمہ کی حیثیت سے ہوگیا۔ مہو میں موجود کہنہ مشق شعرا سے رابطہ رکھنے اور مقامی مشاعروں میں ترنم سے کلام پیش کرنے کی وجہ سے اُن کی آواز مہو سے نکل کر اندور پہنچی اور کچھ عرصہ بعد ہی اُن کو اندور کے گورنمنٹ گرلس اسکول میں اُردو تدریسی خدمات کا پروانہ ہاتھ آگیا۔ اپنی علمی قابلیت بڑھانے کے لیے انھوں نے ملازمت کے ساتھ ہائر سکنڈری، بی ٹی، بی اے اور ایم اے (اُردو) کے امتحانات پاس کیے۔ برسوں تک روزانہ مہو سے اندور آمد و رفت، اپنے دو بچوں کی پرورش اور نگہداشت اور تدریسی ذمہ داری کو دیانتداری سے نبھانے کی بنا پر اُن کو اندور اور قرب و جوار کے اضلاع میں منعقد مشاعروں میں کلام پیش کرنے کا موقع تو بمشکل ہی ملتا تھا البتہ مقامی اخبار و رسائل میں اُن کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا نیز تعطیلات میں منعقد

ہونے والے مشاعروں میں شرکت یا اندور ریڈیو اسٹیشن پر اپنا کلام ریکارڈ اور نشر کرانے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مہر زریں کی شاعری سے دیگر علاقوں کے لوگ کم ہی واقف ہوسکے۔ انھوں نے اپنے خاندانی بزرگوں کے علاوہ صادقؔ اندوری، کاشف الہاشمی اخگرؔ اور عتیقؔ مالیگانوی جیسے اساتذہ سے مشورۂ سخن کیا۔ اُن کی شاعری کی ابتدا1948 کے آس پاس ہوئی تھی اور بقول گوپی چند نارنگ اُس وقت مالوہ میں وہ واحد اُردو شاعرہ تھیں۔ 13/جون 2014 کو اندور میں انتقال ہونے سے کچھ عرصہ قبل تک وہ درس وتدریس کے ساتھ شعروسخن کی آبیاری بھی کرتی رہیں۔ ان کی مجاہدانہ زندگی، انسان دوستی، شریعت کی پابندی اور اپنے پیشہ کے ساتھ دیانتداری کا صلہ رب کائنات کی جانب سے یہ ملا کہ ان کو ۱۵/شعبان بروز جمعہ بعد مغرب یعنی عین شب برأت کے مبارک لمحات میں عالمِ بالا میں بلایا گیا۔ بھوپال کے بزرگ شاعر ظفرؔ نسیمی صاحب نے مہر زریں کی وفات پر درج ذیل تاریخی قطعہ کہا تھا۔

وہ یوم جمعہ ، تیرہ جون اور شعبان کی پندرہ
مسلسل وِرد تھا اس کی زباں پر سورۂ یٰسیں کا
ایازؔ مضطرب کو صبر کی تلقین کر ہمدم!
دلِ نازک پہ صدمہ ہے غروب مہر زریں کا

2014

مہؔر زریں کے مجموعۂ کلام ''کشش'' کی اشاعت اُن کے واحد لائق فرزند ڈاکٹر ایاز احمد قریشی نے 2015 میں بڑے اہتمام سے کی۔ بلاشبہ 216 صفحات کے اس مجموعہ میں شامل چھوٹی بڑی بحور میں تخلیق کی گئی ایک سو پندرہ غزلیات، مختلف موضوعات پر کہی گئی چھبیس پابند نظموں اور چار گیتوں میں اہل ذوق اور سخن شناس صاحبان کے لیے بڑی کشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنی تقریظ کا اختتام ان جملوں کے ساتھ کیا ہے:

''مہر زریں کے کلام کی مجموعی فضا محبت، انسان دوستی اور سماجی مقصدیت سے مملو ہے۔ اُن کی قادر الکلامی بھی لائق تحسین ہے۔ اُن کی شاعری جذبے کی بھٹی میں تپ کر اور طرز ادا سے آراستہ ہوکر ایک منفرد ذائقہ کی حامل بن گئی ہے۔''

ہم نے جب مہر زریں کی غزلیات کا مطالعہ کیا تو آشکار ہوا کہ وہ واقعی آسمانِ شاعری کی مہر زریں ہیں۔ انھوں نے معاشی اور تہذیبی رشتوں کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے اور اُن کی غزلوں میں لطیفِ انسانی جذبات اور نازک احساسات کی عمدہ مصوری ملتی ہے۔ اُن کے اشعار میں عصری کرب بھی ہے اور تہذیبی قدروں کی پامالی کا احساس بھی۔ کلام میں مکالماتی حُسن کی وہ تمام فنّی نزاکتیں موجود ہیں جو ایک اچھے سخن طراز کی پہچان بنتی ہیں۔ وہ روایت سے بغاوت نہیں کرتیں تاہم ان کا ذہن کوری تقلید کا قائل بھی نہیں۔ اُن کے اشعار میں صنف نازک کے تئیں بڑا باوقار اور پُر تمکنت رویہ پایا جاتا ہے۔ اُن کے لب و لہجے میں جو حوصلہ، خود اعتمادی اور ہر سرد وگرم سے مقابلہ کرنے کا جو جذبہ ملتا ہے وہ دوسری شاعرات کے یہاں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ ذیل میں اپنے محسوسات کی تائید کے لیے اولاً چند منتخب غزلیہ اشعار اور غزل پیشِ خدمت ہے:

مقامِ آدمی کچھ کم نہیں ہے
فرشتوں سے تو کم آدم نہیں ہے

یہ عرش سے آنا تو آغازِ محبت تھا
اب فرش پہ آئے ہیں انجام سے کھیلیں گے

روشن ہے ، درخشاں ہے ہر اشک غریبوں کا
بس اُن کی بدولت ہی ہر گھر میں دِوالی ہے

دل میں مری وحشت نے پر جتنے نکالے تھے
میں نے انھیں بل دے کر زنجیر بنائی ہے

فنا کے ہوش فنا ہیں ہماری وحشت سے
وہ ہوں گے اور کہ جن پر فنا کا زور چلے

آپ جو چشم تر ہوگئے
سارے غم معتبر ہوگئے

غزل

یہ کہاں کی دوستی ہے ، یہ کہاں کی دلربائی
شب وعدہ تم نہ آئے تمھیں شرم بھی نہ آئی

یہ کہیں کا زہد و تقویٰ، یہ کہاں کی پارسائی
کبھی غیر سے محبت، کبھی ہم سے آشنائی

مجھے لا کے گلستاں سے کیا قید کے حوالے
یہ خوشی تمھیں تھی لیکن مری جان پہ بن آئی

تمھیں غیر مل گئے تو کٹی رات عشرتوں میں
مری بے بسی میں گزری، مجھے نیند بھی نہ آئی

مجھے کون سی خطا کی یہ سزا ملی ہے زریںؔ
جو کی وصل کی تمنا تو عطا ہوئی جدائی

ہم نے مہر زریں کی غزلیات سے جو نمونے یہاں پیش کیے ہیں اُن سے قارئین از خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ مہر کے کلام میں جو جرأت مندی، بیباکی اور جذبات کی تڑپ پائی جاتی ہے وہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ انھوں نے روایتی شاعرانہ انداز کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے اشعار کو اپنے عہد سے ہم آہنگ کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ اُن کی نظموں میں بھی اسی فکریاتی لمس اور عصری تصادمات کی کسمساتی خوشبو کے جھونکے واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ اُن کی نظم ''آدم اور جہان'' بطورِ نمونہ پیش خدمت ہے:

قبل میرے آنے سے کب یہاں اُجالا تھا
رات بھی اندھیری تھی اور دن بھی کالا تھا
ہو کے پارہ پارہ میں اتنا پھیل جاتا ہوں
اپنے پیچھے سورج کا اقتدار پاتا ہوں
اور پھر تھکا ماندہ چاندنی سے ملتا ہوں
چاندنی کی باہوں میں دھیرے دھیرے ہلتا ہوں
مہر پھر مری خاطر ہنس کے جاگ جاتا ہے
رات ڈوب جاتی ہے ، چاند بھاگ جاتا ہے

مہرؔ نے ''تاریخِ اُردو'' نام سے اکتالیس (41) اشعار پر مشتمل بڑی دلنشیں، دلگداز اور دلسوز مکالماتی نظم کہی ہے۔ ہم یہاں وہاں سے اس نظم کے صرف چھ اشعار پیش کرنے پر اکتفا کررہے ہیں:

میں نے پابندی میں آزادی کے نغمے گائے ہیں
میں نے زنداں میں ترانے عزم کے دہرائے ہیں
اب مجھے کامل یقیں تھا کہ ہر اک اہلِ وطن
مجھ سے ہنس ہنس کر کہے گا جانِ من، جانِ سخن
بات پھر اتنی بڑھی کہ بڑھ کے الجھن ہوگئی
ہندی اُردو میں ٹھنی ایسی کہ ان بن ہوگئی
منزلوں پر منزلیں طے کررہی ہوں صبح و شام
ہے یقیں لے کر رہوں گی ایک دن اپنا مقام

مہرؔ زریں کے کلام کی دلنشینی کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ 1966 میں مشہور گراموفون کمپنی ہز ماسٹر وائس (HMV) نے اُن کے ایک گیت ''مطربہ ساز اٹھا'' پر ایک ریکارڈ جاری کیا تھا ہم اس گیت کو ذیل میں درج کررہے ہیں تا کہ قارئین بھی اس سے لطف اندوز ہوں:

مُطربہ ساز اُٹھا رات چلی جائے گی
پھر وہی گیت سنا رات چلی جائے گی
شب کی آغوش میں مدہوش ستارے ہوں گے
دل پہ تنہائی کے چلتے ہوئے آرے ہوں گے
صبح پھر ہوگی وہی شوخ نظارے ہوں گے
غم کے ماروں نے کہا رات چلی جائے گی
مُطربہ ساز اُٹھا رات چلی جائے گی
زلف کھولے ہوئے برسات کا موقع آیا
بعد مدت کے ملاقات کا موقع آیا
ہائے تقدیر سے یہ بات کا موقع آیا
شمعِ امید جلا رات چلی جائے گی
مُطربہ ساز اُٹھا رات چلی جائے گی
تجھ کو زریںؔ چمکتے ہوئے تاروں کی قسم
ان مچلتی ہوئی مدہوش بہاروں کی قسم
حسنِ رنگیں کی قسم ، چاند ستاروں کی قسم
دل ربا لوٹ بھی آ رات چلی جائے گی
مُطربہ ساز اُٹھا رات چلی جائے گی

مہر زریں کی مجاہدانہ زندگی اور اُن کے فن پاروں سے نیز اس امر سے متاثر ہوکر کہ وہ مالوہ کی اولین صاحبِ دیوان شاعرہ ہوئی ہیں 2016 میں اندور کی دیوی اہلیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے محمد شفیع گنائی نامی طالب علم نے ''مہر النسا مہرؔ: شخصیت اور فن'' عنوان پر ایم فل (M. Phil) کی ڈگری حاصل کی ہے۔

اب ہم مہر زریں کے مجموعۂ کلام ''کشش'' میں نقل کیے گئے ڈاکٹر عزیز اندوری کے ان جملوں کے ساتھ رُخصت چاہیں گے۔

''مہر زریں نے غزلیات کے ساتھ نظم گوئی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں فکری بلندی کے ساتھ اظہار کی شائستگی کے جو نمونے ملتے ہیں انھیں پڑھ کر کہا جاسکتا ہے کہ انھیں ملک کی اعلیٰ شاعرات میں شامل کیا جانا چاہیے۔''

□□□

Dr. Shamim Ahmad Siddiqui
Naseem Manzil, Midah Ganj Police Chowki
Sitapur Road, Lucknow-226020 (U.P)

شاعرات کے منتخب اشعار

آنسو ہیں نہ آہیں ہیں نہ بیداری ہے راتوں کی
مجھے معلوم ہے کیسے کٹی ہیں ساعتیں میری

پکارتے ہیں کنارے کھڑے ہوئے ناداں
مجھے تو ڈوبنا ہے ہاتھ کیوں بڑھاؤں میں

بیگم رضیہ حلیم جنگ

شکوہ نہیں اچھا کبھی فریاد کے بدلے
کرتا ہے ستم بھی کوئی امداد کے بدلے

اللہ بڑا اجر انھیں دیتا ہے خورشید
جو لوگ کرم کرتے ہیں بیداد کے پہلے

خورشید حیدری

غم ہے اک نعمت خداوندی
جتنا برتو اسی قدر کم ہے

بجھ رہے ہیں چراغ دیر و حرم
دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

سحاب قزلباش

غم ہو کہ سکوں ہو، ہمیں جینا ہے بہر طور
مرنے کا یہ انداز بھی کیا خوب رہا ہے

ایک ذرا سی بات پہ کیوں ہے اتنا ہنگامہ ممتازؔ
شیشۂ دل ہی تو ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

ممتاز مرزا

سفر کا ساتھ ہے یہ منزلوں کا ساتھ نہیں
گزر ہی جائیں گے لمحے حساب رہنے دو

اُمڈ آیا ہے شور اوروں کے گھر سے
دریچے کھول کے پچھتا رہی ہوں

فاطمہ حسن

ہاتھ کانٹوں سے کر لیے زخمی
پھول بالوں میں اک سجانے کو

تاریخ یوں لکھی تھی نزولِ بہار کی
ہاتھوں میں آسماں تھا پلک پر ستارہ تھا

ادا جعفری

کہاں کے عشق و محبت کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

تری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں
مری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے

زہرا نگاہ

روزِ ازل سے طے یہ ہوا تھا کٹ جائے بس ایسے ہی
میری عمر جواب دہی میں تیری عمر سوالوں میں

میں زندگی میں مروں گی نہ جانے کتنی بار
مجھے خبر ہے کہ رشتہ مرا صلیب سے ہے

شبنم شکیل

عمرانہ خاتون

اُردو زبان و ادب کی تعلیم اور خواتین

تمام اہلِ علم اس سچائی سے متفق ہیں کہ اُردو زبان و ادب کا فروغ اردو تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔ میری نگاہ میں اُردو ادب کی تخلیق کے عمل سے بھی زیادہ ضروراردو تعلیم کا عمل ہے۔ اُردو زبان و ادب کی اشاعت و توسیع اور روشن مستقبل کے لیے اُردو تعلیم کو طریقۂ تعلیم کے جدید اصولوں کے مطابق انجام دینا ضروری ہے۔ یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ ملک میں ایسی نامور خواتین کی تعداد کم نہیں جنھوں نے اُردو تعلیم کے شعبہ سے وابستہ ہوکر فروغِ اُردو کا مقدس فرض انجام دیا ہے۔ عہدِ قدیم میں جس عورت کو علم و ادب کی روشنی سے محروم رکھا جاتا تھا وہی عورت آج نئی نسل کو علم و ادب کے زیور سے آراستہ کر رہی ہے۔ نسلِ نو کو شعور و آگہی کی نعمت عطا کرنا کسی عبادت سے کم نہیں۔ اُردو تعلیم کا منظر نامہ اُردو تعلیم و تدریس سے وابستہ خواتین کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ بلاشبہ ان خاتون اساتذہ میں بیشتر تخلیق کار بھی ہیں لیکن ان کی تعلیمی اور تدریسی خدمات نے ملک کی جامعات کے اُردو شعبہ جات کو وقار عطا کیا ہے۔ مختلف مواقع پر ناقدین کی جانب سے خواتین قلمکاروں کی ادبی خدمات کا ذکر تو اکثر کیا جاتا ہے لیکن اُردو تعلیم سے وابستہ خواتین کا خاطر خواہ ذکر شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔ اُردو تعلیم کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دینے والی خواتین کا مختصر سا جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

محترمہ قرۃ العین حیدر کو ناول نگار کے طور پر سب جانتے ہیں لیکن آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں ریزیڈینٹ پروفیسر کے طور پر قابلِ فخر خدمات انجام دیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی صاحبزادی ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ابتدائی دنوں میں جو تعلیمی خدمات انجام دیں وہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ انعام اللہ خاں یقین کے دیوان کی تدوین اور اصطلاحاتِ غالب کی فرہنگ کی ترتیب ہے۔ انھیں تعلیمی صلاحیتیں ورثہ میں ملی تھیں جس کا اظہار انھوں نے شعبۂ اُردو کی ملازمت کے دوران بھرپور کیا۔

اسی یونیورسٹی کی پروفیسر شمیم نکہت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر شمیم نکہت خلوص کا پیکر اور اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے دل و جاں سے کوشاں رہیں۔ بطور کہانی کار بھی انھیں اردو ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی تعلیمی، ادبی اور انسانی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ڈاکٹر نکہت ریحانہ خاں کی تعلیمی خدمات بھی کافی اہم ہیں۔ 'منظر پسِ منظر' جو شعبۂ اردو کے اساتذہ کے تذکرہ پر مشتمل ہے کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی کے ڈراموں کا 'تنقیدی مطالعہ'، 'اردو افسانہ 1980 کے بعد' اور قرۃ العین حیدر کے ابتدائی تین ناولوں کا توضیحی اشاریہ بھی ان کی اہم

نگارشات ہیں۔

ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی نے اُردو تعلیم کے میدان میں اپنی بے لوث خدمات کے سبب مقبولیت حاصل کی۔ دورِ حاضر میں یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے رہی اساتذہ میں ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر ارجمند آرا اور ڈاکٹر شاذیہ عمیر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے ادبی سرگرمیوں کے ساتھ سماجی و ثقافتی سرگرمیوں میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ ان خاتون اساتذہ کے تنقیدی مضامین اکثر ادبی رسائل میں شائع ہو کر ان کی تنقیدی صلاحیتوں سے قارئین کو روشناس کراتے رہے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر صادقہ ذکی نے اپنی شرافت، خلوص اور اپنے طلبا کی رہنمائی کے طفیل مخصوص مقام حاصل کیا۔ جامعہ کے شعبۂ اردو کے سابق طلبا و طالبات آج بھی اپنی ٹیچر کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ اس شعبہ کی ایک دوسری پروفیسر صغریٰ مہدی اپنی مہمان نوازی، اردو زبان و ادب کی ترقی اور متوازن نقطۂ نگاہ کے لیے معروف تھیں۔ شاندار طویل خدمات انجام دینے کے بعد 17 مارچ 2014 کو وہ تعلیمی حلقوں کو ہمیشہ کے لیے سوگوار کر گئیں۔ ناول، افسانوں، بچوں کی کہانیوں کے علاوہ بطور مترجم اور محقق بھی انھوں نے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ تدریسی صلاحیتوں کے علاوہ ان کی صاف گوئی اور انسانی اوصاف بھی قابل قدر تھے۔

ڈاکٹر شہناز انجم بھی اس شعبہ کی فعال ٹیچر کے طور پر یاد کی جاتی ہیں۔ طویل عرصہ شعبہ میں خدمات انجام دینے کے بعد 2013 میں سبکدوش ہوئیں۔ 'ادبی نثر کا ارتقاء شمالی ہندوستان میں'، 'خیال در خیال' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ مختلف موضوعات پر مضامین شائع کر کے بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں صدر شعبۂ اردو کے طور پر ریٹائر ہوئیں پروفیسر ثریا حسین کافی مقبول ٹیچر رہی ہیں۔ آپ نصف درجن کتابوں کی خالق اپنے سفرنامہ پیرس و فارس اور جمالیات پر اپنے تنقیدی افکار کے لیے بھی جانی جاتی ہیں۔

دورِ حاضر کی فعال خاتون اساتذہ میں ڈاکٹر سیما صغیر نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی اہم نگارشات میں 'ہندی اردو افسانے کا تقابلی مطالعہ'، 'تانیثیت اور اردو ادب' شامل ہیں۔ بیگم سلطان جہاں پر ان کا مونوگراف ان کی خداداد تخلیقی استطاعت کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر دردانہ قاسمی کی وسیع تدریسی اور تصنیفی خدمات سے اہل قلم واقف ہیں۔ علی گڑھ کے وومن کالج کے شعبۂ اردو کی ڈاکٹر نیلم فرزانہ نے اپنی تعلیمی خدمات کے طفیل یونیورسٹی میں منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ اس کالج کے شعبۂ اردو میں آپ کی طویل ہمہ گیر مساعی جمیلہ قابل ستائش ہیں جو یقیناً فروغ اردو کا باعث ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی اور حیدر آباد یونیورسٹی کا ذکر آتے ہی دو سینئر خاتون اساتذہ کا نام سامنے آ جاتا ہے۔ ایک پروفیسر سیدہ جعفر اور دوسری پروفیسر ثمینہ شوکت۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دونوں خواتین کی گرانقدر خدمات کے بغیر دونوں یونیورسٹیز کے اُردو شعبوں کی تاریخ نامکمل رہتی ہے۔ طلبا کی ایک کثیر تعداد نے دونوں قابل اساتذہ کی زیرنگرانی اپنے تخلیقی مقالے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ پروفیسر سیدہ جعفر کے مختلف تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہو کر دادِ تحسین پاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی زیرنگرانی تسنیم فاطمہ نے 'اردو میں خواتین کے رسائل 1947 تک' اور نکہت آرا شاہین نے 'عصمت چغتائی کے ناولوں میں عورت کے مسائل' کے موضوع پر پروفیسر سیدہ جعفر کی زیرنگرانی اپنے تحقیقی مقالے مکمل کیے۔ افسوس کہ دونوں خواتین ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو چکی ہیں، لیکن اپنی علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

دیگر خواتین اساتذہ میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر فاطمہ پروین، ڈاکٹر فریدہ بیگم، ڈاکٹر فاطمہ آصف کی تدریسی صلاحیتیں بھی اردو طلبا کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ ڈاکٹر رضوانہ معین اور ڈاکٹر عرشیہ جبین کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی علمی حلقوں کی طرف سے کیا گیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد کے قیام کے بعد ڈاکٹر مسرت جہاں، ڈاکٹر بی بی رضا خاتون اور ڈاکٹر نکہت جہاں نے بھی فاصلاتی تعلیم کے میدان میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔ ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کی وقیع خدمات کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ انھوں نے شعبۂ اردو کو بامِ عروج تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بارہ سال پہلے شعبہ سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی علمی و ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ ان کی اہم تخلیقات میں 'حافظ شیرازی'، 'ملا وجہی' اور 'معاصر اردو ناول' شامل ہیں۔ 'اگلے رُت کی آنے تک'، 'موسم بھیگی آنکھوں کا' ان کے شعری افکار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھیں مراٹھی سے اُردو میں ترجمہ کرنے پر بھی عبور حاصل ہے۔ ڈاکٹر معزہ قاضی نے بھی اپنی علمی و ادبی فعالیت اور تدریس میں سنجیدگی سے اپنی مخصوص پہچان بنائی ہے۔

خواتین کی مختلف تنظیموں سے ملک کے مؤقر رسائل میں ان کے

مختلف موضوعات پر مشتمل مضامین کی اشاعت بھی اُردو دنیا کے لیے باعث مسرت ہے۔

بھوپال ہمیشہ سے ادبی، تہذیبی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ جن خواتین اساتذہ نے اُردو کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ان میں پروفیسر وسیم بانو قدوائی، پروفیسر شفیقہ فرحت، پروفیسر فرحت جہاں، پروفیسر بلقیس جہاں، پروفیسر انیس سلطانہ، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں، ڈاکٹر عتیق النساء اور ڈاکٹر فرزانہ رضوی کے نام کافی معتبر ہیں۔ ان خواتین اساتذہ کی نگارشات میں مزاح نگاری، شاعری، مضمون نگاری اور ناول نگاری شامل ہے۔ پروفیسر کوثر جہاں تقریباً تیس سال تک تدریسی خدمات انجام دے کر ریٹائرڈ زندگی گزار رہی ہیں۔ انھوں نے بطور افسانہ نگار بھی اپنا اہم مقام بنایا ہے۔ اے۔ جے۔ ایف۔ روہیل کھنڈ یونیورسٹی کی فعال خاتون ٹیچر ڈاکٹر فہمیدہ کبیر نے تدریس کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی نگراں کے طور پر جو وقیع خدمات انجام دی ہیں اس سے طلبا اور طالبات کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔

آر۔ بی۔ ڈی۔ کالج بجنور کی سابق صدر شعبۂ اردو محترمہ شاہین جیلانی مرحومہ نے کالج کے شعبۂ اردو کی ترقی میں جو رول ادا کیا اور جس طرح بجنور کی اردو طالبات کی تربیت کی وہ انتہائی حوصلہ افزا ہے۔ انھوں نے کالج میں کئی کل ہند سطح کے سیمینار بھی منعقد کیے جن کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اسی شعبہ کی ڈاکٹر فرزانہ خلیل نے بھی ایک فعال ٹیچر کے طور پر اپنا نام پیدا کیا۔ وہ یو جی سی کے نیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والی شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پہلی طالبہ تھیں۔ ڈاکٹر ثمینہ بی بھی شعبۂ اردو کو کامیاب بنانے میں کوشاں ہیں۔

کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی خواتین اساتذہ میں پروفیسر محبوبہ وانی، پروفیسر سجان کور اور ڈاکٹر عارفہ بشریٰ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر عارفہ بشریٰ ان دنوں صدر شعبۂ اردو کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہیں۔ کشمیر کے شعبہ اردو کے ارتقاء میں ان خواتین اساتذہ کی کوششیں قابل تعریف ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کی پروفیسر ریحانہ پروین نے جس خلوص، محنت اور دلچسپی سے طلبا کو اُردو سے آشنا کیا چنڈی گڑھ اُردو حلقوں میں اس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔ 1982 سے یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ 'گلشن مضامین'، اور 'ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کا ایک مطالعہ' ان کی اہم تصانیف ہیں۔

پنجابی یونیورسٹی کی جانب سے مالیر کوٹلہ میں قائم کیے گئے ادارہ نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ برائے فارسی، اردو و عربی کی صدر پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شبنم اس علاقہ کی ایک فعال خاتون ٹیچر ہیں۔ تدریسی خدمات کے علاوہ اردو اور پنجابی کی شاعرہ کے طور پر بھی مقبول ہیں۔ طلبا کی کثیر تعداد نے ان کے زیر نگرانی تحقیقی مقالے مکمل کیے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف اردو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ حکومت پنجاب نے انھیں اسٹیٹ ایوارڈ اور شرومنی ساہت کار ایوارڈ عطا کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

کیرالا کی شری شنکراچاریہ سنسکرت یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر صفیہ بی نے واحد خاتون معلمہ کے طور پر مجموعی ذمہ داریوں کو جس منصفانہ ڈھنگ سے ادا کیا وہ روشن مثال ہے۔ تحقیقی مقالوں کی نگراں کار کے طور پر بھی ان کی سرپرستی علم پرور رہی ہے۔

چودھری چرن سنگھ میرٹھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر شاداب علیم بھی سنجیدگی، انہماک اور خلوص کے ساتھ اپنی تعلیمی ذمہ داریوں کو ادا کر رہی ہیں۔ جدید اردو شاعری کے تعلق سے ڈاکٹر اسماعیل میرٹھی کی ضخیم کتاب نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ محترمہ ڈاکٹر الکا وششٹ بھی اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ ان خاتون اساتذہ کے وجود سے یقیناً شعبۂ اردو کی ہمہ جہت سرگرمیوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

مہاراشٹر کے اورنگ آباد میں ڈاکٹر اختر سلطانہ، ڈاکٹر حسینی کوثر سلطانہ اور ڈاکٹر سیدہ اشرف النساء نے بھی اپنے اپنے طور پر مختلف ادبی اور ثقافتی مشاغل اور تدریسی عطا کے سبب اہم مقام بنالیا ہے۔ مالیگاؤں کالج کی ڈاکٹر فہمیدہ ہارون انصاری کی تدریسی خدمات کے ساتھ سماجی میدان میں دین بھی قابل قدر ہے۔ شری شیواجی کالج پربھنی کی ڈاکٹر ممتاز جہاں سے بھی اردو دنیا کو کافی امیدیں وابستہ ہیں۔

اردو زبان و ادب کی تعلیم سے وابستہ تمام خواتین کا احاطہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ راقمہ نے اردو ادب کی تدریس سے وابستہ خواتین کا اجمالی جائزہ لینے کی حقیری کوشش کی ہے۔ ان خواتین کے علاوہ ہزاروں خواتین اسکول، کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دے کر خواتین کے نام کو بلند کر رہی ہیں۔ انھیں خراج تحسین پیش کرنا ہم سب کا اخلاقی فرض ہے۔

Imrana Khatoon
Research Scholar
8/51, Kashana, GTB Colony
Malerkotla-148023 (Punjab)

پروفیسر توقیر عالم

جدید اردو شاعری میں تانیثیت

سرسید تحریک تک اردو شاعری کی مشہور و مقبول اصناف غزل اور مثنوی میں عام طور پر عورت کا تصور محبوبہ کے روپ میں ہے۔ اس روپ میں تبدیلی کی باضابطہ تحریک انجمن پنجاب کے جلسوں نے شروع کی۔ اردو شاعری کو سماج کے لیے کارآمد بنانے اور شاعری کی سماجی ذمہ داری کی وضاحت کے لیے محمد حسین آزاد نے کئی لکچر دیے۔ 5اگست 1867 اور 19اپریل 1874 کو اس انجمن میں دیے گئے ان کے خطبات جدید اردو شاعری کے آئین کے طور پر قبول کیے گئے۔ 19اپریل 1874 کو اپنے خطبہ کے بعد آزاد نے اپنی نظم 'شب قدر' پیش کی تھی جسے عام طور پر جدید اردو نظم کا پہلا نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ انجمن کے جلسوں میں آزاد کے علاوہ حالی، شبلی نعمانی اور اکبر الہ آبادی نے لگاتار نظمیں پیش کیں۔ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین انصاری حالی پانی پتی نے عورتوں کو معشوقہ اور محبوبہ کے حصار سے باہر نکالتے ہوئے کہا

اے ماؤ، بہنو بیٹیوں

دنیا کی عزت تم سے ہے

اس نظریہ کو مزید تقویت ترقی پسند تحریک نے دی اور مجاز لکھنوی نے خواتین کو براہ راست مشورہ دیا۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن

تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ان نظریات نے شاعری میں عورت کی منفرد حیثیت کو قبول کیا۔

حالی نے اسے محبوبہ اور معشوقہ کی حدود سے آگے بڑھاتے ہوئے ماں، بہن اور بیٹی کہہ کر مخاطب کیا اور دنیا کی عزت سمجھا۔ ترقی پسندی نے اسے مجاہد کا روپ دیا اور اردو ادب کو نسوانی قوت کا احساس دلایا۔ ترقی پسندی کی ابتدا ہی سے تانیثی فکر کی شروعات ہوگئی۔ انگارے میں رشید جہاں کا افسانہ 'دلی کی سیر' شائع ہوا تو مصنفہ کے خلاف کئی فتوے لگے اور عتاب کا شکار ہونا پڑا جب کہ قدامت پرستی پر رشید جہاں سے زیادہ کاری ضرب سجاد ظہیر نے اپنے افسانہ 'جنت کی بشارت' میں لگائی تھی۔ رشید جہاں پر عتاب کی صرف ایک وجہ تھی کہ تانیثی فکر یا مصنفہ کی ناری وادی و چار دھارا اردو والوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ بہر کیف اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ نثر اور نظم دونوں اصناف میں تانیثی ادب کی تخلیق ہوئی اور اس ضمن میں خاتون ادیباؤں کا تعاون کچھ زیادہ ہی رہا۔ تانیثیت ہی کی دین ہے کہ اردو کی شاعرات کچھ زیادہ ہی نکھر (मुख्तसर) ہوگئی ہیں۔

اس مقام پر تانیثی فکر یا تانیثیت کی وضاحت ضروری ہے جو صرف چند جملوں پر مشتمل ہے

عورت ایک مکمل اکائی ہے

مرد سے الگ بھی اس کا ایک مستقل وجود اور شناخت ہے

وہ مرد سے مختلف ہے لیکن کم تر نہیں

تانیثیت نے بہتر نصف کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ مساوی نصف کا

معاملہ اٹھایا۔

ترقی پسندی کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو شاعرات کا غالب رجحان تانیثیت کی جانب پاتے ہیں جو غزلوں میں بھی ہے اور نظموں میں بھی۔ اردو کی مشہور شاعرہ کشور ناہید نے مادام سیمون دی بوا(Madam Simon De Beavoir) کی کتاب The Second Sex کو اردو جامہ پہنایا اور اپنی شاعری میں بھی تانیثیت کو جگہ دی۔ یوں تو ان کی شاعری غزل گوئی سے شروع ہوئی لیکن ان کی نثری نظموں میں جو چبھن موجود ہے وہ غزلوں میں نہیں۔ ان کی ایک نثری نظم 'قید میں رقص' کے چند مصرعے یا جملے ملاحظہ ہوں۔

تم باپ نہیں بن سکے
میرا بھی جی نہیں کرتا کہ تم میرے بچے کے باپ بنو
پھر میرا بدن میری خواہش کا احترام کرتا ہے
میں اپنے نیلو نیل بدن سے پیار کرتی ہوں
مگر تم مجھے کبھی جتنی آزادی کہاں دے سکو گے
تم نے عورت کو کبھی بنا کر بوتل میں بند کرنا سیکھا ہے

اس طرز کا شدید احتجاج ان کی دوسری نظموں میں بھی موجود ہے جن میں طالبان سے قبلہ رو گفتگو، نیلام گھر، جنگل میں ژالہ باری کا منظر، جاروب کش وغیرہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

فہمیدہ ریاض نے مرد اساس سماج پر کڑی چوٹ کی ہے۔ وہ اپنی نظم 'دریدہ بدن' سے مشہور ہوگئیں۔ اس نظم نے انھیں کافی بدنام بھی کیا۔ عورتوں کا استحصال کرنے کے لیے مردوں نے کیا کیا طریقے اپنا رکھے ہیں اس سماجی خرابیوں کو وہ اپنی شاعری کا موضوع بناتی ہیں۔ ان کی نظم 'مقابلہ حسن' (Beauty Competition) میں یہ صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

فہمیدہ ریاض کی کئی دیگر نظمیں مردوں کی بربریت کو طشت ازبام کرتی ہیں۔ مشہور شاعرہ شہناز نبی نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو شاعری کا فرسودہ نظام ان کے یہاں نہیں ملتا۔ حسن وعشق کی روایات نہیں، سیاسی گھن گرج بھی نہیں لیکن تانیثی کیفیت ضرور ملتی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں بھی یہ کیفیت نمایاں ہے۔ غزل کا صرف ایک شعر۔

فلیٹ کی چابی، صوفہ، بستر، کمرے کی ہر ایک شے میری
اس میں بسنے والا آدھا مرد مگر کب میرا ہے

بے شمار اشیا آسائش، عزت، شہرت وغیرہ کے باوجود بھی انسان کو اگر کچھ چاہیے تو وہ ہے اپنا پن کا احساس:

ایاک نعبد و ایاک نستعین

میں ہم اسی بات کا اقرار کرتے ہیں۔ خدا بھی بندے سے یہی چاہتا ہے کہ بندہ اسی کا رہے Sense of Belongingness کی بات ہر جگہ آتی ہے۔ اگر شوہر اپنی بیوی سے فرماں بردار ہونے کی امید رکھتا ہے تو بیوی کو بھی اس طرح کا حق ضرور پہنچتا ہے۔ یہ شعر صرف شاعرہ کے ہی خیالات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ ساری نسوانیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

نظموں میں شہناز نبی کا لہجہ کچھ زیادہ تیکھا ہو گیا ہے۔ پیدائش سے لے کر اخیر عمر تک لڑکی یا عورت کو سخت حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیٹے کی بہ نسبت بیٹی کی پرورش سخت انداز میں ہوتی ہے۔ الگ الگ سماج نے الگ الگ طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ شہناز نبی کی نظر ان تمام حالات پر بھی ہے۔ یہاں صرف ایک مثال ان کی نظم سے، لڑکیوں کے پاؤں بڑے بڑے نہ ہو جائیں اس لیے چین کے کچھ علاقوں میں والدین انھیں بچپن ہی میں لوہے کے جوتے پہناتے ہیں جو بچے کے لیے تکلیف دہ ہے۔ لڑکوں کو لوہے کے جوتے نہیں پہنائے جاتے۔ شہناز نبی نے اس عمل کو والدین کی جانب سے اپنی بیٹی پر ظلم مانا ہے۔ ان کی نظم 'بھول' میں بیٹی کی جانب سے احتجاج ملاحظہ ہو۔

جس نے بھی لوہے کے جوتے پہنائے
وہ سر کی گرفت کرنا بھول گیا تھا
مجھے اس کا غم نہیں کہ آلات حرب کے بغیر
لڑنا تھا ہر پل
مرکب وقت ہے بس
جب فتح کا پرچم لہرائے گا
تب تک نئی جوتیاں تلاش کر لی جائیں گی
لیکن سر کو قید نہ کرنے کی بھول سرزد ہوتی رہے گی

اگر بہ غور دیکھا جائے تو سر اور پیر کو یہاں استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جسم کو اگر قید میں ڈالا بھی جائے تب بھی روح اور دماغ پر قبضہ آسان نہیں ہو پاتا۔ یہ ایک پیغام ہے ساری انسانیت کے لیے کہ صنف نسواں کو بھی آزادی چاہیے۔ زاہدہ زیدی نے تانیثیت کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ ان کا خیال ہے۔

'ایک عام عورت تانیثی رویہ اختیار کر کے اپنی انفرادیت منوا سکتی ہے لیکن جینون (Genuine) شاعری تانیثیت سے بھی آگے کی چیز ہے۔'

ان کی شاعری میں جو دم خم ملتا ہے وہ سچ مچ تانیثیت سے آگے کی چیز ہے۔ ان کے شعری مجموعے (1) 'زہر حیات' (2) 'دھرتی کا لمس' اور (3) 'سنگ جاں' زندگی کے مختلف مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں راہ فرار نہیں بلکہ عزم عمل ہے۔ ان کا خطاب صرف صنف نسواں ہی سے نہیں بلکہ پوری انسانیت سے ہے۔ یہی حال ان کی ان نظموں کا بھی ہے جو دوسری زبان یا ادب سے ماخوذ ہیں۔

1975 میں ادب کے نوبل انعام یافتہ اٹلی کے شاعر 'یوجینو سونتالئے کے پہلے مجموعہ Osside Seppia کی ایک نظم کا ترجمہ زاہدہ زیدی نے 'سنگ جاں' میں پیش کیا ہے جس کی اشاعت جون 1989 میں ہوئی تھی۔

ہم نہیں جانتے کہ کل کیسی ہوگی
مسرت سے پر
یا کہ غم کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی
ہاں مگر اتنا معلوم ہے ہم کو
کہ اب ہم جہاں جائیں گے
تیرے آہنگ کو تیری خاموش سرگم کو بھی ساتھ لے جائیں گے
جو ہماری نواؤں، ہماری تنفس میں پیوست ہے

....

اور اک روز تیری عنایت کے پروردہ
وہ بے صدا الفاظ
جس میں تیرا لمس پوشیدہ ہے
خامشی اور واماندگی سے گزر کر
ہماری رگوں میں اتر آئیں گے
اور ہم اپنے لب پر ترا ذائقہ
موج زن پائیں گے

تین بندوں والی اس نظم کا پہلا بند تشکیک کی صورت کو پیش کرتا ہے۔ دوسرے بند میں امید کی کرن ہے اور آخری بند میں یقین محکم کی کارفرمائی ہے۔ اپنے مزاج کے مطابق ہی زاہدہ زیدی نے ترجمہ کے لیے اس نظم کا انتخاب کیا۔ وہ اپنی فکر کو تانیثیت سے بالاتر سمجھتی ہیں۔

زاہدہ زیدی کی بہن ساجدہ زیدی بھی خود کو تانیثیت سے بالاتر ہی سمجھتی ہیں۔ ساجدہ زیدی کے شعری مجموعوں (1) جوئے نغمہ (2) آتش سیال (3) سیل وجود (4) آتش زیر پا' کو دیکھنا چاہیے۔ جب وہ مناظر فطرت کا بیان کرتی ہیں تو الفاظ میں مصوری کے نقوش دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اساڑھ کے ہلکے ہلکے بادل
چھڑی وہ بھادوں کی دوپہر کی
وہ کوکلوں کے گداز نغموں میں اس بدلتی ہوئی رتوں کا
وہ نیل گوں صبح کی فضائیں
وہ دل نشیں شام کے دھندلکے
ہمارے آموں کے باغ، بانسوں کے جھنڈ، دریاؤں کے کنارے
ہمارے سرسوں کے کھیت، پیپل کی چھاؤں، ذرات کے اشارے

آزاد نظموں میں ان کی توانائی کا عزم کچھ زیادہ ہی قابل داد ہے

کئی دریا ہو کے پار کر آئی
کئی آتش کدوں میں جذب دل کندن بنا آئی
مگر اب بھی مری زنجیر آہن کڑکڑاتی ہے
مجھے جب جب بھی نیلا آسماں حسرت سے تکتا ہے
میں اپنے آتش دل سے جلا دیتی ہوں اس زنجیر کی کڑیاں
ستاروں تک پہنچتی ہوں
مدار نور میں مہتاب کی ہم رقص ہوتی ہوں

شاعرہ نے یہ بات بڑی پختگی سے بتا دی ہے کہ ستاروں تک پہنچنے میں نسوانیت کوئی رکاوٹ نہیں بلکہ ایک قوت ہے۔

تشخص کی لڑائی کئی شاعرات کے یہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ سماج اور خاندان کو بنانے میں دونوں کا تعاون ہے۔ کسی ایک شعبہ میں ایک فریق کا تعاون کم اور دوسرے شعبہ میں زیادہ ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر کسی کو کمتر سمجھنا یقیناً ناانصافی کی بات ہوگی۔ شاعرات جب اپنی تانیثی پہچان پر آمادہ ہو جاتی ہیں تو ان کا لہجہ بھی بدل جاتا ہے اور عجیب عجیب ترکیبات استعمال کرنے لگتی ہیں۔ یہ لہجہ کبھی کبھی طبع سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ ملاحظہ ہو محترمہ بلقیس ظفیر الحسن کی ایک نظم کا اقتباس۔

تمھاری طرح ایک انسان ہوں میں
تمھاری پالتو بلی نہیں میں
جسے بستر میں تم ایسے سلا کر
ان کی خرخر سے بہت محظوظ ہوتے ہو
تمھاری طرح مجھ کو بھی خدا نے ایک وجود اپنا دیا ہے
کسی کم تر خدا کی خلق کردہ کیوں سمجھتے ہو
مجھے محفوظ رکھنے کے بہانے مت تراشو

تمھاری طرح اپنی زندگی میں آپ جینا چاہتی ہوں

یہاں ساری جنگ صرف اور صرف اپنی شناخت کے لیے ہے۔

کشور ناہید نے کم از کم مکھی جیسی آزادی طلب کی تھی اور بلقیس ظفیر الحسن کو شکایت ہے کہ عورتوں کو پالتو بلی کی طرح سمجھا گیا ہے۔ مکھی اور بلی کی یہ تشبیہات نادر روزگار ہیں اور قاری یا سامع کی توجہ کو زیادہ آسانی سے اپنی جانب مبذول کر لیتی ہیں۔

بہاری نژاد پاکستانی شاعرہ پروین شاکر جب پابند شاعری کرتی ہیں تو کافی محتاط رہتی ہیں لیکن آزاد شاعری میں ان کا تیور بدل جاتا ہے۔ انھوں نے کم عمری سے ہی لکھنا شروع کیا۔ پچیس سال کی عمر میں ان کا پہلا مجموعہ کلام 'خوشبو' شائع ہوا تھا اور وہ خوشبو والی شاعرہ کے طور پر مشہور ہوگئیں۔ اس کے بعد 'صد برگ'، 'خود کلامی'، 'انکار' اور آخر میں 'کف آئینہ' یعنی کل پانچ مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ غزل میں ان کا لہجہ نکھرا ہوا ہے اور زندگی کا کرب نہایت سنجیدگی سے ادا کیا گیا ہے:

کب شکوۂ تغافل و بیداد سب سے ہے
تجھ سے گلہ ہے اور نہایت ادب سے ہے

کانٹوں میں گھرے پھول کو چوم آئے گی لیکن
تتلی کے پروں کو کبھی چھلتے نہیں دیکھا

نظموں میں ان کا لہجہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ اپنی نامرادیوں کا رونا بھی ہے اور احتجاج بھی۔ ازدواجی زندگی کا کڑواپن اس نظم میں ملاحظہ ہو:

میں نے سو سو جتن کیے
پر مجھ پر روپ نہ آیا
کیسر پنکھڑی، حنا کے پتے، ہار سنگھار کے ڈنٹھل
اور کسم کے پھول
سب آنچل میں بندھے رہ گئے
کوئی مرے کام نہ آیا
گہنے پاتے گئے اکارت
پتی کا پیار بھی مری کایا بدل نہ پایا
رہی میری چنری پھیکی کی پھیکی
ہاں بس اک رُت ایسی آئی تھی
تن کے سندر بن میں ساتوں رنگ کے پھول کھل اٹھے تھے
لیکن پہلی ہی بارش میں
ایک ذرا سی دھوپ ہوئی
اور پل بھر میں سب دھول

خاتون ادیباؤں کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا تکلیف دہ بیان ملاحظہ ہو:

'ہمارے ہاں! شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے ہر مرد خود کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا اس لیے اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔'

ترقی پسندی کے وقت سے ہی نظموں کا رجحان بدلا۔ پہلے صرف پابند نظمیں ہوا کرتی تھیں پھر معریٰ نظموں کا چلن ہوا پھر آزاد نظمیں اور جدیدیت کے آتے ہی نثری نظموں نے بھی اپنی اہمیت منوا ہی لی۔ قافیہ، ردیف، وزن، آہنگ وغیرہ کی پابندی نہیں ہونے کی وجہ سے جذبات اور واقعات نگاری پر زیادہ زور صرف ہوا اور شاعر کو اپنی بات زیادہ موثر انداز میں کہنے کی آزادی حاصل ہوئی۔

لیکن ان سب کے باوجود ایک بنیادی سوال اپنی جگہ ہے۔ شعر کس کو کہتے ہیں؟ کیا موزونیت، موسیقیت ترنم، آہنگ اور لے کے بغیر بھی شاعری ممکن ہے؟ اگر ہاں تو پھر نظم اور نثر کا فرق کیا رہ جاتا ہے اور اگر نہیں تو پھر نثری شاعری یا آزاد شاعری کا جواز کیا رہ جاتا ہے۔

کچھ بھی ہو جدید نظموں نے اردو ادب کے دامن کو وسیع تر کر دیا ہے۔ آج سے قبل جو باتیں شعر میں پیش کرنے کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھیں ان کو بھی جدید نظموں نے سماج اور دنیا کے سامنے رکھا اس طرح ترسیل و ابلاغ کا کام نسبتاً آسان ہو گیا۔ اگر شاعری نام ہے احساس و جذبہ کی ترجمانی کا تو جدید نظمیں یقینی طور پر کامیاب کہلانے کی مستحق ہیں۔ تانیثی فکر پیش کرنے والی بہت سی شاعرات کا ذکر اس مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکا ہے۔ ہمارا ارادہ اس موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھنے کا ہے جس میں دیگر اہم شاعرات کی تانیثی فکر کو پیش کیا جائے گا۔

□□□

Prof. Md. Tauquir Alam
Pro-Vice Chanceller
Maulana Mazharul Haque Arabic & Persian University
Harding Road,
Near Haj Bhawan
Patna-800001 (Bihar)

نفیس بانو ہاشمی

اردو اسکولوں میں سائنس
نصاب اور تعلیم

قرآن، بائبل اور گیتا میں سائنس کا ذکر پوری طرح کیا گیا ہے کہ انسان درخت کے پھل پھول سے جتنا ہو سکے فائدہ اٹھائے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی نے تعلیم سے متعلق کہا تھا کہ مفت اور لازمی تعلیم ہونی چاہیے اسی طرح ہندوستان کے دستور کے دفعہ 45 شق کے تحت 14 سال کی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم رکھی جائے جس کا عمل ابھی جاری ہے۔

ہمارے ملک کی عدالت عالیہ سپریم کورٹ نے بھی یہ کہا ہے کہ ایک بچہ کا بنیادی حق ہے کہ وہ 14 سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرے۔ عالمی بینک کا بھی یہی نظریہ ہے کہ جمہوری ملک کے لیے تحتانوی تعلیم ایک اہم پہلو ہے جو جمہوریت کو برقرار رکھتا ہے۔

The review Committee on the national policy on Education in 1986, The central Govt. admited 40% of World's illierates are in our country. Kothari commission of 1964 to 66 نے بھی یہ مشورہ دیا ہے جس کے ذریعے تعلیم کے مقصد کو مکمل طور پر پائے تکمیل تک لے جایا جاسکتا ہے۔

سائنس ایک مشعل راہ و سنگ میل ہے The Challenge to Science Principles are the foundation stone of life as well as-of science education B.C. Roi

یہ قول اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کے لیے سائنس بہت اہمیت رکھتی ہے اور سائنس نظامِ تعلیم کا ایک اہم مضمون ہے۔

ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج میں پنجم سے کالج تک سائنس کو اہمیت دینی چاہیے وہ اس لیے کہ ایک طالب علم کی روزمرہ کی زندگی میں سائنس ہر پہلو پر عمل پیرا ہے چاہے وہ کسی بھی زبان، علاقہ یا مذہب کا ہو۔ زندگی سے لے کر موت تک تقریباً ہر جاندار کا وجود سائنس پر ہی ہوتا ہے بیکن کے مضمون میں It has lengthened life--and will be, its starting past to marrow.

بیکن کا سائنسی اصول ہے کہ قوانین زندگی کی مدد کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

آج کا دور سائنس کا دور ہے۔ راکٹ کی برق رفتاری نے انسان کو چاند اور مریخ تک پہنچا دیا ایٹم بم ٹی وی ایس ٹی ڈی، فیکس،

موبائل، لیپ ٹاپ جیسی سہولتوں نے انسان کی عملی زندگی کو بہت آسان کردیا ہے یہ سب سائنسی کرشمات ہیں۔

سائنس کا مشاہدہ: تاریخ وتفصیل:

مندرجہ ذیل سائنسی نظریات مشاہدات 120 ہائی اسکول اور تقریباً 5000 طلبہ 4000 اساتذہ سائنسی ٹیچر شامل ہیں جس میں پانچ ہزار لڑکیاں، ایک ہزار لڑکے مراٹھی، انگلش، اردو، ہندی زبان کے اسکول شامل ہیں مکمل سروے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سائنس میں آج بھی 70-80% طلبا دلچسپی رکھتے ہیں۔ (چالیس سالہ تدریسی تجربہ)

1۔ لڑکیوں کی نظر میں سائنس ایک دلچسپ مضمون ہے بہ نسبت لڑکوں کے جن کا 98% حصہ ہے۔

2۔ لڑکوں نے سائنس کو A source of power سمجھا ہے جس کا تناسب 80% ہے۔

3۔ بائیو لوجسٹ نے سائنس کو صاف سماجی اور coring مضمون سمجھا ہے جس کا تناسب 60% ہے۔

4۔ ماہر طبعیات کو ایک اہم اور ذہین مشق، جمہوری اور دماغی مضمون تصور کیا ہے جس کا تناسب 60% ہے۔

5۔ کیمیائی تجربہ گاہ میں کام کرنے والے اکیلے سائنس داں اور طلبا کا تناسب 6% ہے۔

6۔ انگلش میڈیم سے جو لڑکے اور لڑکیاں سائنس داں بنے وہ صرف 20% ہے۔

7۔ سائنسی نظم و ضبط رکھنے والے مضامین کیمیا میں 65% طبعیات میں 11% اور بایولوجی میں 30% ہے۔

8۔ گوکہ ہائی اسکول کا تناسب آج بہت زیادہ ہے اور بہ نسبت لڑکوں کے لڑکیاں کلاس میں زیادہ حاضر رہتی ہیں اور ان کا پسندیدہ مضمون سائنس ہی بنتا جا رہا ہے۔ خصوصیت سے دیہی علاقوں میں بھی ان کا تناسب زیادہ ہے۔

سائنس نصاب وتعلیم:

آج کے دور میں سائنسی نصاب ذیل کی طرح ہونا چاہیے۔

(1) ابتدائی تعلیم سے لے کر ثانوی تعلیم میں سائنس شامل ہونی چاہیے۔ لیکن عملی طور پر جیسے پودوں، پتوں، پھولوں، پھلوں کی معلومات ٹیچر بذات خود کسی نرسری میں لے جا کر اس کے بارے میں اور معلومات فراہم کرائیں۔

(2) جماعت پنجم سے لے کر بارہویں تک سائنس کو عملی طور پر پریکٹیکل بنانا چاہیے۔

(3) نصاب میں کسی مذہب یا ذات کا ذکر نہ ہو۔

(4) تفریحی مقامات۔ چڑیا گھر محفوظ جنگلی جانور گاہوں کا بذات خود ٹیچر اور طلبہ مشاہدہ کریں جس میں ایک تربیت یافتہ گائیڈ ہونا چاہیے۔

(5) سائنسی کونسلنگ کا ایک پیریڈ اور تجربہ گاہ ہونا چاہیے۔

(6) تجربہ گاہیں مکمل طور پر سائنسی آلات، کیمیائی اشیا، طبعائی آلات، جغرافیائی سامان کے ساتھ آراستہ ہو اور الگ الگ کلاس ہونی چاہیے۔

(7) نصاب میں حکومت اور سائنسدانوں کا سائنسی رجحان شامل ہو۔

(8) نصاب میں مالی امداد کافی ہونی چاہیے جو اس وقت 6% ہے۔

(9) سائنسی تجربہ گاہ کے لیے مخصوص سہولت اور محکمہ ہونا چاہیے جو سال بھر نگرانی کرے۔

(10) ابتدائی تعلیم جیسے پنجم جماعت سے معمولی گھریلو اشیا کے طور پر اسباق ہونا چاہیے۔

(11) پڑھانے اور سکھانے کا طریقہ کار عملی ہونا چاہیے۔

(12) آج کا نصاب کچھ حد تک مناسب ہے مگر طلبا کو عملی کام نہیں سکھایا جاتا ہے۔

(13) آج کے دور میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال لازمی ہے جو اسکول سے شروع کیا جانا چاہیے۔

(14) سائنس کو پڑھانے اور سمجھانے کے لیے کم از کم پانچ سالہ تجربہ کار سائنسی ٹیچر منتخب ہونا چاہیے۔

(15) تدریس کے طریقہ کو بطور تدریس ہونا چاہیے نہ کہ روزگار کا ذریعہ۔

(16) تمام نصاب حکومت منتخب کرے اور باصلاحیت تجربہ کار اساتذہ سے کرے۔

□□□

Nafees Bano Hashmi
Rtd. Head Mistress
C/o. A.A. Hashmi, Behind Seema Building
Roshan Khan Corner
Parbhani-431401 (M.S)

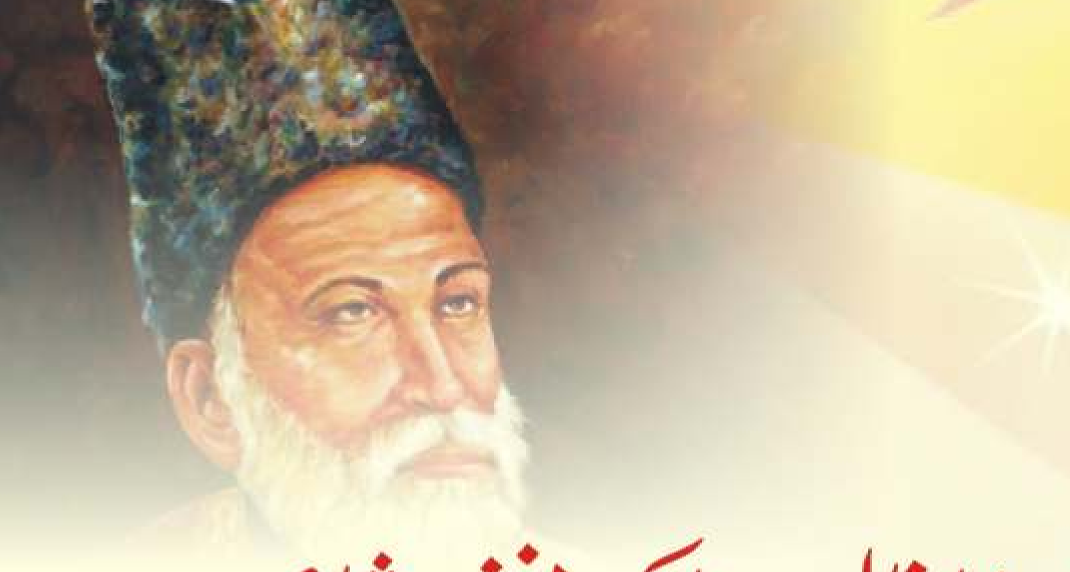

رضیہ پروین

مرزا غالب: ایک منفرد شاعر

ادب کی زبان میں مرزا غالب کو شہنشاہ سخن کہا گیا ہے۔ یہ قول سابقہ آمیز ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے خالی نہیں ہے کیونکہ غالب نے جس صنف سخن پر بھی طبع آزمائی کی منفرد و ممتاز رہے۔ انھوں نے نہ صرف غزل کو ہی مشق سخن بنایا بلکہ دیگر اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی۔

اس میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں کہ غالب نے غزل کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کی سی گرمی عطا کی۔ غالب کو زندگی کے سرد و گرم حالات سے سابقہ پڑا۔ زندگی کے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ تلخ تجربات کیے تھے معاشی سختیاں جھیلیں تھیں لہٰذا ان تمام امور کی جھلکیاں ان کے کلام میں فطری طور پر نظر آتی ہیں:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

انسانی زندگی غموں سے عبارت ہے اور غالب کا عہد معاشی بدحالی، سیاسی زوال کا زمانہ تھا اور شاعری کے نزدیک غم روزگار بڑی قیمتی متاع ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں غم عشق اور غم روزگار دونوں موجود ہے۔ وہ ایک طرف معاشی بدحالی کا شکار تھا تو دوسری طرف سماجی ابتری، افرا تفری اور غیر ملکی حکومت کے مظالم کو دیکھ کر اس کا دل خون ہو چکا تھا۔ غالب کے یہ اشعار اس ضمن میں کافی اہمیت رکھتے ہیں:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

مرزا غالب طوفان حوادث سے گھبراتے نہیں۔ بلکہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو غالب کے یہاں عشق کی والہانہ کیفیت نہیں اور نہ ہی پائے صنم پر سجدہ کرتے ہیں۔ ان کا عشق بھی عقل کا دامن نہیں چھوڑتا۔ وہ محبوب سے روٹھتے بھی ہیں اور وہ بھی کچھ اس طرح سے:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

غالب عشق و محبت کی ان کیفیات کو اپنی شاعری کا محور بناتے ہیں جن سے انسانی جذبات میں لطافت اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے:

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں!
تیری زلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہو گئیں!

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں تیرا راہ گزر یاد آیا

غالب ایک زبردست فنکار تھے۔ جن کی فنکاری میں جذبہ وسوز کی شمع، تخیل کی پرواز، ادراک کی قوت، وجدان کا حسن، آس و یاس کی کشمکش، درد کی کسک، گداز کا لطف، شوخی وطنز کی چاشنی، جدت وندرت کی چاندنی، اشاریت و ایمائیت کی سحر کاری اور انفرادیت کی دلنوازی ہے۔ جدید تشبیہات و استعارات اور حسن وادا سے غالب کا کلام مقناطیسی قوت رکھتا ہے۔ ان کا لہجہ مخصوص اور تیور غضب کا ہے۔ غالب نے اپنے کلام میں حادثات زمانہ کو جگہ دے کر اس کی تقدیر ہی بدل دی۔ غزل کو محبوبانہ شوخی سے ہمکنار کرنے کے لیے طنز وظرافت کی شائستگی اور سنجیدگی نے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرلیا۔ اس طرح جدت پسندی کے حسین امتزاج نے غالب کے کلام کو دلکشی بخشی۔ انھوں نے کہیں رنگ بدلا تو کہیں انداز۔ جدت پسندی نے ان کے کلام کو دوآتشہ بنادیا:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انداز بیان کی جدت دیکھیے:

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب فلسفی نہ تھے۔ وہ اسرار حیات ورموز کائنات کا ایک معقول تصور رکھتے تھے۔ ذہن انسانی کو دعوت فکر دینا ان کی شاعری کا مقصد بن گیا۔ تصوف کے رنگ میں کہتے ہیں:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہوجائے
کام اچھا ہے جس کا کہ مآل اچھا ہے

یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری اور شخصیت دونوں کو کمال حاصل ہے۔ ان کا کلام ایک بحر بیکراں ہے۔ جن کو چند صفحات پر رقم کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ انھوں نے پیکر غزل کو حسن وعشق کا غازہ اور سماجی شعور وتہذیبی سرمایہ کی مہک بھی دی ہے۔ دوش غزل پر انسانی فضا کا آنچل ڈالا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ غالب کی خوبیوں کو اجاگر کرنے اور عوام کو ان کے کلام کی خوبیوں سے روشناس کرانے میں ان کے مداحوں اور طرفداروں نے بڑا کام کیا ہے۔ حالی سے شروع ہوا یہ سلسلہ روز بروز قائم ہے۔ ایسا نہیں کہ غالب کے کلام پر اعتراضات نہیں ہوئے بلکہ غالب کے کلام پر نکتہ چینی بھی خوب ہوئی کہ مشکل پسند ہیں، فارسی ترکیب اور الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ تبھی تو حالی نے 'یادگار غالب' میں ذکر کیا ہے کہ:

'میر تقی میر نے جو مرزا کے ہم وطن تھے ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی استاد کامل مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔' (یادگار غالب، ص 106)

لیکن یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ غالب نے خود اپنی مشکل گوئی کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ میرے کلام کو چاہے کتنی بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے عنقا ہی رہے گا:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

غالب ہمیشہ روش سے ہٹ کر چلے انفرادیت ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ عامیانہ راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنا الگ انداز تحریر ایجاد کیا۔ جہاں تک ان کے اردو کلام میں فارسیت کا غلبہ ہے تو انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا اور اپنی فارسی دانی پر فخر بھی محسوس کیا:

ہیں دنیا میں اور بھی سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب کے اوراق زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غالب بڑے ہی وسیع القلب انسان تھے۔ وہ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی کو محض انسان تصور کرتے تھے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

'بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان ہندو یا نصرانی ہو عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔'

آج کل انسانیت، دردمندی تو جیسے ختم ہوتی جارہی ہے۔ آئے دن ظلم وستم کی داستان، ہر روز کی خون ریزی...... کاش وہ غالب کے ان اشعار سے کچھ سبق لیتے تو شاید اس طرح کے حالات پر قابو پایا جاسکتا:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

بس کے دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

تشبیہات واستعارات کا استعمال شاعری میں ایک لطیف تاثیر پیدا کرتا ہے۔ غالب نے اپنے کلام میں نئی تشبیہات و استعارات کا استعمال کرکلام میں ندرت پیدا کی ہے، ان کی تشبیہات میں جو تازگی اور طرفگی ہے اس کا ثبوت ان اشعار سے ملتا ہے جن میں خیال اور تاثیر کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں:

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ، ہے حلقہ میری زنجیر کا

فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

سب کومقبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

غالب کے تخیل کی گہرائی اور گیرائی ، دور اندیشی اور نا آسودہ تمناؤں کا پتہ ان کے شعری پیکروں سے با آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ غالب ان پیکروں کے ذریعے، محدود کے احساس کو جگانا چاہتے ہیں (اور یہ صرف غالب کے یہاں ہی کیوں اردو کے قدیم وجدید بیشتر شعرا کے یہاں ہمیں دیکھنے کوملتا ہے۔) ان کا مقصد ان فضاؤں کی طرف اشارہ کرنا ہے، جو انسانی عزم وہمت کو جادہ پیمائی پر آمادہ کرتی ہیں۔ غالب چونکہ حس مزاح رکھتے تھے تاہم ان کے اندر بے چینی، تجسس اور گہری فکر کا جذبہ شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری ان کے شدید ذاتی تاثرات کا ردعمل ہے۔ ان کی امتیازی خصوصیت ان کا تفکر ہے جوان کے بے چین دل اور عمیق ذہن کا ردعمل ان کے یہاں جذبات کی تندی اور ذہن کی برق رفتاری بہ یک وقت ملتی ہے۔ وہ صرف جذبات کا تجزیہ ہی نہیں کرتے بلکہ اس میں باہمی تعلق بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محبت ان کے لیے کوئی ایسا جذبہ نہیں جو انتہائی فطری طور پر دلکش محاکات کی صورت میں ڈھل جائے۔ وہ ایک شعلہ ہے، ایک لاوا ہے جو پوری شخصیت کے اندر ہلچل پیدا کردیتا ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری کے تانے بانے میں نکتہ آفرینی اور ندرت فکر کی جگمگاہٹ صاف نظر آتی ہے:

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاں نورد تھا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

لو وہ بھی کہتے ہیں بے ننگ ونام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

غالب کی شاعری پہلودار اور تہہ دار ہے۔ گہرے خیالات ونازک احساسات اور خورد بینی مشاہدات کو ترشے ہوئے تخیلی پیکروں میں اس طرح مشکل کر دینا کہ ان سے شاعرانہ اشاریت کی شعاعیں پھوٹ نکلیں، یہ بڑی کامیابی اور زندہ رہنے والی شاعری کی علامت ہے اس لیے غالب جیسے بڑے شاعر کے مطالعے کے لیے علمی بصیرت اور نقطۂ نظر کی وسعت ضروری ہے۔ یہ تمام اشعار اس بات کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں:

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس طرح دیکھا جائے تو غالب نے اردو غزل کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے غزل کے حسن کو پروان چڑھایا۔ غالب کے حسن بیان، شاعرانہ صلاحیتوں اور خوبیوں کو مختصر مضمون میں احاطہ کر پانا ممکن نہیں۔ ان کی شوخی، رنگینی، طنز وظرافت ، نکتہ آفرینی اور بزلہ سنجی نے حالی کو انھیں 'حیوان ناطق' کی جگہ 'حیوان ظریف' کہا ہے۔

انھوں نے منفرد لب ولہجے سے اردو شاعری کو نہ صرف بام عروج تک پہنچایا بلکہ اسے نئے طرز فکر اور نئے آہنگ سے روشناس کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ سب سے ممتاز اور منفرد سمجھا اور یہ محض تعلّی نہیں بلکہ اپنے فن کا صحیح ناقدانہ شعور اور ایک حقیقت بھی تھی۔

□□□

Razia Parveen
Asst. Professor Urdu
Mumtaz Park, Jail Road
Rampur-244901 (U.P)

غزالہ فاطمہ

عصمت چغتائی 'چوتھی کا جوڑا' کے آئینے میں

اردو کے افسانوی ادب میں عصمت چغتائی ایک بڑا نام ہے۔ جسے منٹو کا نسائی قالب بھی کہا گیا۔ مگر عصمت کی اپنی ایک شناخت ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں جس بے باکی سے جنس کو موضوع بنایا اس نے اس عہد کو حیران کر دیا کیوں کہ اس سے قبل خواتین صرف اخلاقی اور اصلاحی ادب کی طرف ہی مائل تھیں۔ قدامت پسند مسلم گھرانے عورتوں کی تعلیم کو آوارگی سمجھتے تھے۔ عصمت نے اصلاحی اور تبلیغی دور میں اس قدر بے باکی سے لکھا تو انھیں شہرت بھی خوب ملی اور وہ لوگوں کے لعن طعن کا شکار بھی ہوئیں۔ لیکن اس سے ان کی مقبولیت میں کمی نہ آئی بلکہ ان کی شہرت میں اضافہ ہی ہوا اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے خواتین قلم کاروں کو اظہار کے نئے امکانات سے آشنا بھی کیا۔

اردو افسانہ نگاری میں عصمت چغتائی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ''چوتھی کا جوڑا'' ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی اہم افسانے لکھ کر اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ متوسط مسلم گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیوں کی زندگی ان کے فکشن کا اہم موضوع رہا ہے۔ وہ اس طبقے سے گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ اپنے ہم عصروں کے مقابلے ان کا دائرہ محدود ضرور ہے لیکن ان کو فن پر کمال قدرت حاصل ہے۔ ان کے یہاں فنی پختگی ہے، روایت سے بغاوت ہے۔ عصمت نے افسانہ نگاری کے ذریعے سماج اور معاشرے کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ ان کے یہاں سماج کی ناہمواری، ذہنی غلامی، رجعت پسندی، توہم پرستی، مذہبی تعصب، ظلم واستحصال اور طبقاتی کشمکش کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں جنسی اور نفسیاتی حقائق کا بے باکانہ تخلیقی اظہار ملتا ہے۔ عصمت چغتائی کو مغربی مفکروں، دانشوروں اور ادیبوں سے گہری مناسبت تھی۔

عصمت چغتائی نے جس دور میں لکھنا شروع کیا اس دور میں ایک نئی روش کا آغاز ہونے کے ساتھ ادیبوں میں حقیقت پسندی کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ جنس عصمت کا پسندیدہ موضوع تھا۔ انھیں متوسط طبقے کی جنسی زندگی کے بارے میں گہری معلومات ہے اور وہ جسے بڑی بے باکی سے اپنے افسانوں میں پیش کر دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اہل زمانہ نے ان پر لعنت وملامت بھی کی۔ فحش نگاری کے الزام میں ان پر مقدمے بھی چلے اور ان افسانوں نے اپنی اشاعت کے ساتھ زمانہ میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ تل، گیندا، لحاف، بھول بھلیاں، عصمت کی بدنام کہانیوں میں شامل ہیں۔ عصمت کی کہانیاں ہی نہیں بلکہ اپنی تیزی وطراری اور تیکھے پن کی وجہ سے خود عصمت بھی بہت بدنام ہوئیں کیونکہ منٹو کی طرح عصمت بھی سماج کو آئینہ دکھاتی ہیں۔ سماج میں پھیلی ہوئی بُرائیوں اور عیبوں کو آشکار کرنا چاہتی ہیں تا کہ ان کا علاج کیا جا سکے۔ ایک جگہ عصمت خود بھی لکھتی ہیں۔ ''جب زخم میں مواد بھر جائے تو اس پر پٹیاں باندھنے سے بہتر ہے کہ نشتر لو اور جراحی شروع کر دو۔''

عصمت چغتائی کا افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' ہندوستانی سماج کے غربت زدہ طبقے کی محرومیوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس افسانے میں بڑا درد و کرب نمایاں ہے۔ ہمارے سماج کے نچلے طبقے میں غریب ماں باپ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں کی شادی کا ہے۔ ان کی شادی کے لیے لڑکا ڈھونڈنا ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ خاص کر ان لوگوں کے لیے ہے جو غریب ہیں اور بیٹی کے لیے لمبا چوڑا جہیز نہیں دے سکتے۔ بیٹیوں کی شادی کی فکر میں ماں باپ کا دن کا چین اور رات کی نیند

حرام ہو جاتی ہے۔وہ مسلسل کوشش کیے جاتے ہیں۔لیکن جب کوئی مناسب رشتہ نہیں ملتا تو ناچار قسمت کے مارے تھک ہار کر امید کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ادھر لڑکی بڑھتی عمر کے ساتھ احساس کمتری کا شکار ہوتی جاتی ہے اور دولہے کے انتظار میں اپنی جوانی کے حدود سے گزر جاتی ہے۔اسے اپنا مستقبل تاریک اور ڈراؤنے خواب کی طرح خوف زدہ کرتا رہتا ہے۔ ماں باپ کا بڑھاپا دن بہ دن انھیں قبر تک لے جانے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ان کے صبر اور استقلال کا باندھ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔وہ اس بے رحم سچائی سے منھ چھپا کر کسی غیبی طاقت سے مدد کی امید لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔لیکن کسی کو کیا پتا کہ زندگی کس قدر بے رحم ہے خاص طور سے غربت کے مارے ماں باپ کی جو بیٹیوں کے والدین بھی ہیں۔

یہ کہانی ایک ایسے خاندان کی ہے جس کی سرپرست بی اماں ہیں جن کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ان کے انتقال کے بعد گھر کی کفالت کی ذمہ داری بی اماں کی ہے۔ان کی دو جوان لڑکیاں کبریٰ اور حمیدہ ہیں۔بی اماں کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اور مقصد کبریٰ کی شادی ہے۔کبریٰ ڈری، سہمی، خاموش طبیعت کی معمولی شکل وصورت والی لڑکی ہے۔والد کے انتقال کے بعد اس کے لیے شادی کا کوئی پیغام نہ آیا اس کے انتظار میں اس کی عمر تیزی سے گزر رہی تھی۔امیدیں ختم ہو رہی تھیں۔تبھی بی اماں کے منجھلے بھائی کا لڑکا راحت پولس کی ٹریننگ کے لیے ان کے گھر میں قیام کرنے کے لیے آتا ہے تو ان کی امیدیں اس سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔وہ اپنا زیور بیچ کر گھر ٹھیک کرواتی ہیں اور راحت کے رہنے کا انتظام بھی کرتی ہیں:

''اسی وقت اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منھ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لا دیں۔باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی۔اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ساری رات کروٹیں بدلتی گزری۔ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔''

(افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'')

بی اماں تو اس قدر گھبرائی ہوئی تھیں کہ مانو راحت ان کے گھر بارات لے کر آرہا ہو۔وہ خوش تھیں کہ اللہ نے ان کی دعا سن لی ایسا لگتا ہے جیسے دروازے پر بارات کھڑی ہو۔حمیدہ نے اپنی ماں اور آپا کی دلی کیفیت کو سمجھتے ہوئے فجر کی نماز میں سربسجود ہو کر دعائیں مانگی۔

''اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میرے آپا کا نصیبہ کھل جائے۔میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔''

یہ ایک چھوٹی بہن کی اپنی بڑی بہن کے لیے سچے دل سے نکلی ہوئی دعا تھی۔کبریٰ اپنے جذبات کو ظاہر نہ ہونے دیتی تھی کیوں کہ وہ شرم وحیا کی ماری لڑکی تھی اور زبان کھولنے سے قاصر تھی۔لیکن دل ہی دل میں وہ خوش تھی۔کب سے اپنے دولہے کا انتظار کر رہی تھی اب انتظار کی گھڑی ختم ہونے کا وقت تھا۔راحت آیا سیویوں اور گھی ٹپکتے پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلا گیا۔راحت کی روز خوب خاطر مدارات ہوتی۔اس کی خاطر تواضع کے لیے وہ لوگ روکھا سوکھا کھا کر روز راحت کو مزہ دار اور اچھے سے اچھا کھانا کھلاتیں۔ان سب میں بی اماں کا چھوٹا موٹا جو زیور موجود تھا سب بک گیا، مگر مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ان کی اس غربت کے حالات کا بیان عصمت نے اس طرح کیا ہے:

''جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور ہاتھوں کی دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے۔خود روکھا سوکھا سا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔''

بی اماں یہ سب اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کے لیے کر رہی تھیں۔آخر کو ان کا ہونے والا داماد ہے۔مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ جس شجر کا پھل کل کو کھانا ہو اس کی آبیاری تو آج ہی سے کرنی پڑتی ہے۔بی اماں سوچتی ہیں کل کو راحت ان کا اپنا ہو جائے گا جو کمائے گا ان کی بیٹی کے ہاتھ پر ہی تو رکھے گا۔اس پر مسرت خیال سے ہی ان کو تقویت ملتی ہے۔اتنی خاطر مدارت کرنے کے بعد بھی جب راحت کی کوئی رضامندی ظاہر نہیں ہوتی تو بی اماں اپنی منھ بولی بہن کو بلا کر مشورہ کرتی ہیں تو وہ صلاح دیتی ہیں کہ حمیدہ راحت سے ہنسی مذاق کرے۔بہنوئی کی طرح اس سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ بی اماں کا نسخہ کامیاب ہوتا ہے اور راحت دن کا زیادہ تر وقت گھر پر گزارنے لگتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے سے حمیدہ کو آوازیں دیتا رہتا ہے۔وہ حمیدہ کو چھیڑتا ہے اور اسے غلط نظروں سے دیکھتا ہے۔حمیدہ کو یہ سب برا تو لگتا ہے لیکن وہ اپنی بہن کی خاطر یہ سب برداشت کرتی رہتی ہے۔راحت کی بیباکیاں بڑھتی جاتی ہیں اور بی اماں اور ان کی منھ بولی

بہن بہت خوش ہوتی ہیں کہ اب بات بن جائے گی لیکن نہ راحت کچھ کہتا ہے اور نہ اس کے گھر سے کوئی پیغام آتا ہے۔ آخر کار بی اماں اپنے توڑے گروی رکھ کر مشکل کشا کی نیاز دلاتی ہیں۔ محلے کی لڑکیاں اور عورتیں آتی ہیں۔ کبریٰ شرما کر مچھروں والی کوٹھری میں بیٹھ جاتی ہے۔ مولوی صاحب کا دم کیا ہوا ملیدہ حمیدہ کو دیا جاتا ہے کہ راحت کو کھلا آئے۔ مجبوراً لاچار حمیدہ اپنی بہن کے لیے وہاں جاتی ہے۔ اس واقعے کا بیان عصمت نے اس طرح کیا ہے۔

''یہ.... یہ ملیدہ۔'' اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پیر لرز رہے تھے۔ جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا... اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کوہ میں ڈوبتا چلا گیا... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔ نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔''

راحت جو مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر کے جا چکا ہے۔ اصل میں ناشکرے پن کی مثال ہے۔ وہ ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ ان کے گھر میں بن بلائے مہمان کی طرح پڑا رہا اور آخر میں ان سب کا چین و سکون لے کر چلا گیا۔ اس کا چلے جانا جہاں بی اماں کی تمناؤں کا خون تھا وہیں حمیدہ کے لیے وجہِ سکون و اطمینان، اور کبریٰ کے لیے کیا تھا اس کا بیان تو نہایت ہی افسوس ناک ہے:

'اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے۔ دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگتی پیچھے پیچھے آرہی تھی ایک ہی جست میں انھیں دبوچ لیا اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔'

کبریٰ کو اس زندگی سے نجات مل گئی جو اس کے لیے مسلسل موت کی مانند تھی جس سے وہ روز مرتی اور روز جیتی تھی۔ وہ افسانے کا ایسا کردار ہے جو ہمیشہ خاموش رہ کر اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہی اپنی زندگی کا بوجھ ڈھوتی رہی۔ اسے زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہ ملی۔ نہ اس نے کبھی زور سے قہقہہ لگایا نہ کبھی شوق سنگھار کیے وہ تو بے چاری غریب ماں باپ کی ایسی اولاد تھی جو غریبی کے باعث اس کا گھر نہ بسا سکے اور اس کی شادی نہ ہو سکی۔ اس کی زندگی اسی پر بوجھ بن گئی تھی جسے وہ مسلسل ڈھوئے جا رہی تھی۔ موت نے اس بوجھ سے نجات دلا دی۔ غربت کی چکی میں پستی رہی اور ازدواجی زندگی کے خواب بنتے ہوئے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی:

''کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا کہ وہ جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشاں ہوئیں۔ نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے۔ اور نہ کبھی ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی، سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔''

یہ افسانہ بلاشبہ عصمت چغتائی کی حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے۔ اس افسانے میں عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کے اس اہم مسئلہ سے جڑی کمزوریوں کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے کی ابتداء عصمت بہت جاذب اور دلچسپ انداز میں کرتی ہیں۔ اس کا انجام درد و غم سے لبریز تعجب خیز اور فکر انگیز ہے۔ اس افسانے کے کردار اور زبان و بیان میں عصمت نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ جزئیات نگاری میں تو عصمت کا جواب نہیں اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''کبریٰ کی ماں کے پر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی۔ چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اجاگر ہو گئیں، جیسے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔''

افسانے کی زبان خوبصورت تشبیہ، استعارہ اور محاوروں سے آراستہ ہے۔ عصمت کو لفظوں سے کھیلنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ کب کون سا

جملہ استعمال کرنا ہے انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لفظ کسی نگینہ کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ لفظوں کا استعمال موقع کے لحاظ سے موزوں ومناسب ہوتا ہے۔ اس کی چند مثالیں پیش کرتی ہوں۔

- ''ابا کتنے دبلے پتلے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھا کھڑا ہونا دشوار تھا۔''
- ''کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ نتھا جائے گا۔''
- ''اری او نک چڑھی ! بہنوئی سے کوئی بات چیت''

ان کے افسانوں کی کامیابی کا راز ہی ان کی دلکش زبان ہے۔

بقول کرشن چندر:

''نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے، کنائے اشارے اور آوازیں کردار اور جذبات و احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں''۔

عصمت اپنے زبان وبیان اور طنزیاتی لب ولہجہ کے اعتبار سے بھی قابل قدر اور انفرادیت کی حامل ہیں۔ ان کی زبان متوسط طبقے کی معیاری زبان ہے۔ عورتوں کے مخصوص لب ولہجے اور محاورات کا جیسا برمحل استعمال عصمت کے یہاں ملتا ہے اس کی مثال نہیں۔ ان کے لفظی مصوری کا ہی کمال ہے کہ ان کی کہانی کا ہر کردار اور واقعہ قاری کی نگاہوں کے سامنے روشن ہو جاتا ہے۔

Ghazala Fatma
Research Scholar
Deparment of Urdu
Jamia Millia Islamia
New delhi 110025

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................... بتاریخ....................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

نورالصباح

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں مسائل نسواں کی بازگشت

قرۃ العین حیدر نے 20/جنوری 1927 کو اس عالم آب وگل میں ایسی سرزمین پر آنکھیں کھولیں جو علم وادب کا گہوارہ اور دانش علم وہنر کا مخزن ہے۔وہ سرزمین ادب علی گڑھ کی ہے، جہاں سے بڑے بڑے ادیبوں نے فیض حاصل کیا۔

قرۃ العین حیدر کا گھرانہ مشرقی ومغربی تہذیب کا مرکب تھا۔ان کے والد سجاد حیدر یلدرم خواتین کی تعلیم کے حامی تھے۔اس لیے ان کے اثرات قرۃ العین حیدر کی شخصیت پر بھی مرتب ہوئے۔جس طرح سجاد حیدر یلدرم نے عورتوں کی اعلی تعلیم ،رشتہ ازدواج کے لیے لڑکیوں کی مرضی ،ان کو معاشرے میں اہم مقام دلانے کی بات کی اسی طرح قرۃ العین حیدر نے بھی عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔عورتوں پر ہورہے ظلم سے پردہ اٹھایا ،انھیں اعلی طبقہ میں استحصالی زندگی سے آگاہ کیا۔پدرسری سماج پر طنز کے تیر برسائے،ان کی حاکمیت کے زیر اثر محکوم عورتوں کی مظلومیت کو پیش کیا۔مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں کو چلنا سکھایا۔ان کے یہاں جاگیردارانہ نظام کی شکست وریخت پائی جاتی ہے، جو رومانیت کی برفیلی چادر میں ڈھکی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر ان میں درماندگی، غم انگیزی اور حزن وملال کی فضا بھی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔جسے یا تو سماجی جبر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یا اس ماحول میں ایسی پروردہ ذہنیت سے جو عورتوں کو اپنے تصرف میں لینا چاہتی ہے۔

قرۃ العین حیدر عورتوں کو ثانوی درجہ میں رکھنے پر شدید شاکی نظر آتی ہیں۔عورتوں کے لیے سماج میں دوہرے رویے اپنائے گئے ،انھیں کمتر سمجھا گیا۔ جہاں قدیم معاشرت میں عورتیں محض ایک سامان تعیش تھیں جدید معاشرت بھی اسی نقش قدم کو اپنائے ہوئے ہیں۔عورت صرف ایک سامان کا درجہ رکھتی ہے ۔اس کا اپنا کوئی مرتبہ متعین نہیں ہے۔اس کو الگ خانوں میں تقسیم کردیا گیا ہے، حتی کہ ادب بھی اسی درجے میں پہنچ گیا ہے جس کو قرۃ العین حیدر ایک انٹرویو میں بیان کرتی ہیں:

> ”ہمارے نقاد لکھنے والی خواتین کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ ان کی الگ قومیت تسلیم کرلی گئی ہے۔ادب کی دنیا میں تو یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ دنیا کے ہر موضوع پر مرد کو لکھنے کی آزادی ہے۔عورت صرف اپنے دل کی بات اپنے گھر کی بات کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

(ایوان اردو دہلی رقرۃ العین حیدر نمبر2008،ص:14)

ادب کو خانوں میں منقسم کیے جانے اور عورتوں کو ایک الگ قومیت سمجھے جانے پر وہ سخت نالاں تھیں۔اس لیے ان کے افسانوں میں صرف عورتوں کے دل کی بات نہیں نظر آتی بلکہ تاریخی حوالے سے قدیم و جدید کی معاشرت کے پس منظر میں عورتوں کی زندگی کے نشیب وفراز موجود ہیں۔ان کے یہاں فریب محبت میں زہر پیتی ہوئی عورت کی کہانی ملتی ہے۔بیوہ عورتوں کی ستم ظریفی کے آثار دکھتے ہیں۔ان کے نسوانی کردار متوسط طبقے، اعلی متوسط طبقے اور نچلے متوسط طبقے میں پدری

حکومت کے ستائے ہوئے ملتے ہیں۔ مصر کی تاریخ ہو یا جرمن وروس کے مابین جنگوں کے سلسلے ، ہر جگہ، ہر دور کی چکی میں عورتیں ہی پستی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں نسوانی شعور کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس سے عورتوں کے عبرتناک مسائل کی وابستگی کا احساس ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر چونکہ اعلی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اوران کی تعلیم بھی اعلی درجے کی تھی اس لیے ان کے افسانوں میں قدیم وجدید کا تحیر آمیز امتزاج بھی ملتا ہے۔انھوں نے اپنے وسیع مطالعہ ،عمیق مشاہدے اور گہرے وژن سے اپنی تحریروں کو لازوال کر دیا ہے۔ان کی تحریروں کو مشترکہ تہذیب کے قدیم و جدید امتزاج نے کچھ ایسا رنگ دیا ہے کہ زمانے کے تغیرات وانقلابات کی وجہ سے تہ وبالا مناظر کچھ اس طرح سے سامنے آگئے ہیں کہ منظر وپس منظر کی جھلکیاں ہی ان کی فنکاری کا اعلی نمونہ بن گئی ہیں۔انھوں نے عمدہ تکنیک ،دلکش پیرائے، عصری حسیت اور فلسفیانہ شعور سے عہد عتیق کے تہذیب وتمدن ، معاشرت افکار ونظریات کا موجودہ عہد سے موازنہ کرکے تاریخی جھروکوں سے کچھ یوں پردے اٹھائے ہیں کہ عورتوں کی دگرگوں حالت کا اندازہ اس وقت کے سماج سے عصری زندگی میں بھی کیا جاسکتا ہے۔اس ضمن میں ان کا افسانہ ''روشنی کی رفتار'' دیکھا جاسکتا ہے ۔ اس میں انہوں نے 1315 قبل مسیح میں مصری حکومت کے قاہرہ شہر کی تہذیب و ثقافت کا ذکر کرتے ہوئے بنی اسرائیل پر فراعنہ کے ظلم وستم کو بیان کیا ہے۔''روشنی کی رفتار'' کا نسوانی کردار مس پدما میری ابراہام کرین جس کی عمر 29 سال ہے۔وہ جنوب ہند کے Space research center میں ملازمت کرتی ہے ۔وہ اپنے موجودہ عہد 1966 سے 1315 قبل مسیح کی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اس کی ملاقات ثوث نامی شخص سے ہوتی ہے۔وہاں پہنچ کر اپنی پہچان پوشیدہ رکھنے کے لیے خود کو افلاک کی دیوی کا فرستادہ بتاتی ہے تاکہ کوئی اس پر شک کرکے اس کو ہلاک نہ کردے ۔اس عہد میں ان لوگوں کے کئی خدا تھے۔ جن کے آگے وہ سربسجود ہوتے تھے ۔ان کے خدا، حورس، رع، آمون، ہاتون جن کی وہ حمد وثنا بیان کرتے تھے۔اس افسانے کے نسوانی کردار ڈاکٹر پدما نے اس کا فائدہ اٹھا کر خود کو دیبی، حاثور وغیرہ کی داسی بتا کر قاہرہ کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس وقت اس کا نام ممفس تھا۔ وہاں مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے آخر کار اس کی ملاقات ''ثوث'' سے ہوتی ہے جو بادشاہ کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ اپنے سفر سے اب لوٹنے والا ہے۔جب بادشاہ کی سفر سے واپسی ہوتی ہے تو وہ مس پدما کو خدا کا فرستادہ سمجھ کر بہت خوش ہوتا ہے اور اس سے شادی کا اعلان کر دیتا ہے ۔اب بادشاہ کی روگردانی کرنے کی ہمت کہاں؟ پدما کسی طرح سے وہاں سے ثوث کے ذریعہ بھاگنے میں کامیاب ہوجاتی ہے اور ثوث کو بھی اپنے عہد میں لے کرآتی ہے ۔وہ اپنے آرٹ اور پینٹنگز کی وجہ سے بہت جلد اہل ثروت میں شمار ہونے لگتا ہے اور اس کے شب و روز، شباب وشراب میں گزرنے لگتے ہیں ۔جس کی وجہ سے وہ پدما کو بالکل بھول جاتا ہے۔ کیونکہ پدما معمولی شکل وصورت کی مالک ہوتی ہے، جب کہ عہد جدید گلیمر کا شیدائی ہے۔ پدما اس کی بے توجہی کا شکار ہوکر افسردہ رہنے لگتی ہے۔ثوث بھی اس ترقی یافتہ عہد کے طرز معاشرت سے اکتا جاتا ہے اور اپنے عہد میں جانے کی خواہش کرتا ہے کیوں کہ اس کی نظر میں قدیم مصر اور جدید عہد میں کسی تفریق کا معاملہ نظر نہیں آتا۔فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ فراعنہ بنو اسرائیل پر ظلم کرتے اور اشوریہ سے جنگ کرتے، جبکہ جدید عہد میں پوری دنیا جنگ کا میدان بنی ہوئی ہے اور ہر جگہ نسلی فسادات میں لوگ مارے جارہے ہیں ۔قرۃ العین حیدر ''ثوث'' کے ذریعے سے تین ہزار سال بعد بھی ایک ایسے متمدن عہد پر طنز کرتی ہیں۔ جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے:

''تمہارے مذاہب ،فلسفے ،اخلاقیات ،نفسیات ،وہسکی کا گلاس میز پہ پٹخ کر زور سے ہنسا۔''تمہاری دیو مالائیں نظریہ حقیقت ،روحانیت ،یہ ،وہ ،سب ،عین سائنٹفک ہیں ۔ تمہاری جنگیں ہیومنزم پر مبنی ہیں۔تمہارا نیوکلیر بم بھی خالص انسان دوستی ہے ۔ ہے نا۔؟ تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے۔''

(افسانوی مجموعہ روشنی کی رفتار افسانہ روشنی کی رفتار،قرۃ العین حیدر، ایجوکیشن بک ہاؤس، دسمبر 2014 ،صفحہ 215)

قرۃ العین حیدر اپنے تاریخی شعور کی وجہ سے تغیر وتبدیل میں فرق واضح کرتے ہوئے صرف سائنٹفک طریقہ کار کو تبدیلی کی وجہ بتاتی ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مس پدما جو ایک معمولی شکل وصورت کی حامل ہے۔ وہ قدیم مصر میں بادشاہ کے لیے اہم بن جاتی ہے، جبکہ بادشاہ ضعیف ومعمر ہے، مگر وہ مس پدما سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی عورتوں کی استحصالی صورت کی طرف اشارہ ہے اور عہد جدید میں لوگ گلیمر کے رسیا ہیں۔ ان کو ہر وہ خوبصورت چیز دلکش اور جاذب نظر لگتی ہے۔ جو ان کی ہم نشینی میں چار چاند لگادے ۔ یہ عورت کے لیے سب

سے بڑا مسئلہ ہے۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے کہ عورت اگر معمولی شکل کی ہے تو کوئی بھی اس کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے، اپنانا تو دور کی بات ہے اس کی ہم نشینی کو سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا یا اس پر مائل بہ کرم ہونا شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ پدری سماج کے شاہانہ نظام کے تحت ایسی لڑکیاں لائق توجہ نہیں سمجھی جاتی ہیں، اگرچہ کہ وہ ان کی زندگی کو اعلی درجے تک پہونچانے میں معاون کیوں نہ ہوں؟ ان کا عمل دخل ان سے بھی زیادہ کیوں نہ ہو، سماج میں عزت وشان کا درجہ دلانے میں اس لڑکی کی کارفرمائی کیوں نہ ہو، مگر وہ توجہ کی حامل نہیں ہوتی۔ پدرشاہی نظام کے تحت مردوں کو لڑکیاں خوبصورت چاہیے ہوتی ہیں، پتلی کمر والی، خوبصورت غزالی آنکھوں والی، لڑکی کی لمبائی چھ فٹ کے اندر اندر ہو لڑکا چاہے ڈیڑھ بالش کا ہی کیوں نہ ہو۔ قرۃ العین حیدر نے عہد جدید کے مطابق عورت کو گلیمر سے تعبیر کیا ہے ایک کردار کی زبان سے کہلواتی ہیں:

> ''پدما بدستور جنوبی ہند کی اس لیبوریٹری میں ملازم تھی۔ سال پہ سال گزرتے گئے تو ایک روز اس کی ماں نے کہا تمہارا انچشین کو پنک دوست شادی نہیں کرے گا کیا؟ سنا ہے بمبئی میں ہر وقت چھوکریوں میں گھرا رہتا ہے۔'' پدما خاموش رہی۔ ٹوٹ کو اس سے ملاقات کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ کبھی سال دو سال میں اتفاقاً مل جاتا۔ کرسمس اور سال نو کے کارڈ البتہ پابندی سے بھیجتا۔ بات دراصل یہ تھی کہ پدما معمولی شکل وصورت کی سیدھی سی لڑکی تھی اور موسیو ٹوٹ ہر میز ایک گلیمرس (Celebrit) جو حسیناؤں کے نرغے میں شاداں وفرحاں تھے۔ دوسری بات یہ کہ مرد چاہے وہ 1315 قدیم کا ہو، چاہے 1973 کا ذہنیت اس کی وہی رہے گی۔ بیہودہ۔'' (ایضاً، صہ 214-213)

جدید عہد کی عورت چاہے وہ کتنی ہی تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہو اگر معمولی شکل وصورت کی ہے تو مردوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ محض درد وکسک کی ایک تصویر بن کر رہ جاتی ہے۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے گلیمر کے شیدائی ٹوٹ کی شخصیت کے حوالے سے پدما کی معمولی شکل کو پیش کر کے عورتوں کی ناقدری بیان کی ہے، جبکہ تاریخی حوالے سے عورتیں اس وقت بھی محض بطور ہدیہ کے خوش کیے جانے کے قابل سمجھی جاتی تھیں، جس کو انھوں نے مصر کے بادشاہ فرعون کی شادی کے اعلان سے پیش کر دیا ہے:

> ''فرعون مصر ہاتھ باندھ کر ادب سے ڈاکٹر کرین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور یوں گویا ہوا۔ زہرہ جبیں دختر افلاک! یہ مصر کی عین خوش نصیبی ہے کہ اشوریہ سے جنگ کے دنوں میں مادر خداوند نے تم کو یہاں بھیجا اور فتح کی بشارت دی۔ مابدولت چونکہ خود رع دیوتا کے فرزند ارجمند ہیں، ہمارا فرض ہے کہ بطور مہمان نوازی وسپاس گزاری کل شام کے پانچ بجے تم سے شادی کرلیں۔'' (ایضاً، ص 205)

قرۃ العین حیدر کی فنکارانہ صلاحیت یہ ہے کہ وہ تاریخ کے حوالے سے بادشاہوں کی شکر گزاری کے نذرانے میں عورتوں کی بے حرمتی کو پیش کرتی ہیں کہ عورت کسی بھی زمانے میں قدر واہمیت نہیں رکھتی۔ زمانہ جدید میں عورت بے بس، لاچار، اور درد وکرب میں مبتلا ہے۔ دونوں زمانوں میں عورت کی حالت میں تفریق محض یہ ہے کہ آج کی عورت تعلیم یافتہ ہے مگر کم شکل ہونے کی وجہ سے شادی کے قابل نہیں سمجھی جاتی۔ آج بھی عورت کی وہی قدر ہے جو زمانہ قدیم میں تھی۔ مرد چاہے عہد قدیم سے تعلق رکھتا ہو یا عہد جدید میں سانس لے رہا ہو وہ ذہنی طور پر خود کو حاکم ہی سمجھتا ہے۔ عورت ہر حال اور ہر عہد میں ادنی حیثیت رکھتی ہے۔ چاہے زمانہ روشنی کی رفتار سے کتنا ہی ارتقائی منزلوں تک پہنچ گیا ہو مگر عورت اسی پستی کی باشندہ سمجھی جاتی ہے۔ قدیم عہد کی طرز معاشرت، تہذیب و ثقافت، جنگ وجدال کا موازنہ کرتے ہوئے عورتوں کے مسائل کو بھی مد نظر رکھا، اس موازنے سے مجموعی طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ زمانہ روشنی کی رفتار کی سی سرعت سے چاہے کتنا ہی آگے بڑھ گیا ہو، ہم چاہے کتنے ہی سائنٹفک طریقے سے سوچتے ہوں، وہ دیو مالائی عناصر ہوں، مذاہب ہوں، فلسفے اور اخلاقیات ہی کیوں نہ ہوں، عہد قدیم کی جنگیں بھی اقتدار کے لیے لڑی جاتی تھیں۔ عہد جدید کی جنگیں بھی اقتدار کے لیے ہی لڑی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کا مقصد دوسرے جرائم کو پھیلانا اور فسادات برپا کر کے فضا کو آلودہ کرنا ہوتا ہے۔

زندگی کے لمحات مصروف ہو چکے ہیں، حتی کہ ہماری سوچ پر بھی مصروفیت کا پہرہ ہو چکا ہے۔ ہر شخص اپنی مصروف زندگانی میں مشغول ہے تو پھر وہ عورتوں کو کیوں کر وقت دے سکتا ہے۔ وہ بھی پدما جیسی معمولی لڑکی کو جبکہ لوگ گلیمر کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، اس گلیمر زدہ، اور ارتقاء پذیر زندگی کے باوجود ہم 1315 قبل مسیح میں ہی سانس لے رہے ہیں، کل بھی عورت مجبور تھی آج بھی عورت مجبور ہے، کل بھی بے سہارا تھی، آج بھی عورت بے سہارا ہے، کل بھی کسک واضطراب کا مجسمہ تھی،

آج بھی عورت مضطربانہ زندگی بسر کر رہی ہے۔ قرۃ العین حیدر اپنے تاریخی روایات کی روشنی میں معاشرتی مسائل بیان کرنے کے حوالے سے مشہور ہیں۔ انھوں نے ماضی کی روایات واقدار کو عزیز رکھتے ہوئے وقت اور زمان ومکان کے اعتبار سے مسائل کی چیرہ دستی کی ہے۔ مشترکہ تہذیب کے زوال پر وہ ماتم کناں نہیں، تغیرات زمانہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں، جو ان کے کرداروں کے ذریعہ سے واضح ہوتا ہے، مگر زمانے کے تغیرات عورتوں کے لیے زوال کا باعث ہی بنتے ہیں ''حسب نسب'' کی چھمی بیگم کے کردار کے ذریعہ سے انھوں نے تین تہذیبوں کو پیش کیا ہے اور ان تہذیبوں میں رضیہ بیگم کی گراوٹ جدید عہد کا المیہ ہے، مگر 'چھمی بیگم' کس المنا کی سے گزر کر 'رضیہ بیگم' کے در پر پہنچیں یہ مصنفہ کی 'مشاہداتی' مطالعاتی، اور فکری تجزیے کا متقاضی ہے۔ جنھوں نے چھمی بیگم جیسا لازوال کردار تخلیق کیا۔ اگرچہ ''حسب نسب'' اپنے اقدار وروایات کی پامالی سے محفوظ رکھنے کے لیے تخلیق کا ذریعہ بنا، اس کے پورے بیان میں 'چھمی بیگم' کی غم واندوہ، تنہائی اور کرب ناکی میں ڈوبی ہوئی تصویر کا المیہ ہے جو صرف ایک شخص کے ٹھکرائے جانے کی دین ہے جو انھیں چھمی بیگم سے بوا کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ چھمی بیگم کا درد اور احساس محرومی کا پتہ افسانے کی ابتدائی سطروں سے ہوجاتا ہے:

> ''لمبے چوڑے سیلے ہوئے غسل خانے میں دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا۔ پیتل کے جھال پال، تیتڑے، اونچا حمام، مٹکے، چوکی، رنگ برنگی صابن دانیاں، بیسن، ابٹن، جھانوے لوٹے، آفتابے، مگے، کھونٹیوں پر غراروں اور پیلے دوپٹوں کا انبار، آنولوں ریٹھوں سے بھری طشتریاں، اندھیرا اخندوں مواعلی بابا چالیس چور کا غار لیکن یہی غسل خانہ چھمی بیگم کی دکھی زندگی میں وقت بے وقت جائے پناہ کا کام دیتا تھا۔ اس کے ہرے شیشوں والی بند کھڑکی کا رخ چنبیلی والے مکان کی طرف تھا۔ اس کے ایک شیشے کا رنگ ناخن سے ذرا سا کھرچ کر چھمی بیگم نے باہر جھانکنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا کہ چھمی بیگم کے لاڈلے ابن عم اجو بھائی چنبیلی والے مکان میں رہتے تھے۔ پہروں وہ اس شیشے میں سے سامنے والے گھر کو اس طرح تکتیں جیسے شاہ جہاں اپنے قید خانہ میں سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا۔''

(افسانہ حسب نسب، افسانوی مجموعہ روشنی کی رفتار، ص 38)

قرۃ العین حیدر نے زمینداری خاندان میں پرورش پانے والی چھمی بیگم کی نفسیات کو بہت ہی دردمندی سے پیش کیا ہے۔ جن کی منگنی بچپن میں ہی ان کے چچا زاد بھائی اجو سے ہوجاتی ہے۔ وہ سولہ سال کی ہوتی ہیں تو ان کی شادی کی تیاریاں عروج پر ہوتی ہیں۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ ہوتی ہے کہ وہاں وبا کا قہر ٹوٹ پڑتا ہے جو شاہجہاں پور کے پورے علاقے میں پھیل کر ان کے والدین کو بھی اپنی موت کی آغوش میں لے لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شادی التوا میں پڑ جاتی ہے، مزید ستم یہ کہ ان کے چچا اور چچی بھی وقتاً فوقتاً جاں بحق ہوجاتے ہیں اور وہ اجاڑ، سنسان گھر میں بے امان و بے سہارا رہ جاتی ہیں۔ اجو بھائی مقدمے کے بہانے آئے دن لکھنؤ رنگ رلیاں منانے کی غرض سے جاتے ہیں۔ آخر کار وہ ایک طوائف کلو سے شادی کر کے اپنے گھر شاہجہاں پور لاتے ہیں۔ چھمی بیگم جو یاس وامید کے مابین معلق رہتی ہیں۔ ناامیدی کی ایسی اتھاہ گہرائی میں غرق ہوجاتی ہیں کہ ان کا غسل خانہ جو کبھی ان کی جائے پناہ ہوا کرتا تھا اندھے کنویں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چھمی بیگم کی بے بسی درج ذیل عبارت میں دیکھی جاسکتی ہے:

> ''جی ہاں ہمیشہ کی طرح بانکے چھبیلے اجو بھائی دالان میں آئے۔ جھک کر اس لال چڑیل سے کچھ کہا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ چھمی بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، نیم تاریک غسل خانہ اب بالکل اندھا کنواں بن گیا۔ انھوں نے جلدی سے ایک کھونٹی پکڑ لی۔ لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں اور بے سدھ ہوکر اپنے بستر پر گر گئیں۔'' (ایضاً، ص 42)

قرۃ العین حیدر نے عورتوں کی محرومیوں کو سمجھا اور اپنی فنی خوبیوں، عمیق مشاہدے، فکری نظریے سے اس کو اپنے افسانوں میں پیش کردیا۔ چھمی بیگم کی بے چارگی محض چھمی بیگم کی نہیں ہے بلکہ یہ محرومی اور بے چارگی ایسی ہی عورتوں کے مقدر پر منعکس ہوتی ہے جو روایتوں کی پاسداری کا مہرہ بن جاتی ہیں اور انھیں ان روایتوں پر چلنے کے لیے تنہا چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے ساتھ عیش پرستی کی جانے لگتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے چھمی بیگم کی شکل میں عورتوں کے حزن والم کی تشکیل کی ہے جو روایتوں کی پاسداری میں باہر نہیں نکلتی تھیں۔ نہ تو عورتوں سے ہی زیادہ تعلقات رکھتی تھیں کیوں کہ انھیں اپنے حسب نسب کا زیادہ خیال تھا مگر اسی حسب نسب اور اقدار وروایات شکنی ایک مرد کے ہاتھوں ہوتی ہے جو چھمی بیگم کو ٹھکرا کر ایک طوائف سے شادی کر کے اس کو گھر میں لاتا ہے۔ یہاں قرۃ العین حیدر نے ایک سوال کھڑا کیا ہے کہ کیا ایک عورت ہی ہر چیز کی پاسباں ہوتی ہے؟ کیا ایک عورت کو اپنی زندگی خود

جینے کا حق نہیں ہوتا ہے؟ انہوں نے قدروں کی پاسداری میں ایک عورت کی زندگی کے نشیب و فراز کو پیش کیا ہے۔ چھمی بیگم جو اجو بھائی کے روپے لینے سے انکار کرتی ہیں۔ وہی اچانک تقسیم ہند کے بعد بیگم صبیح الدین کے بچوں کی استانی بن جاتی ہیں۔ بیگم راشد کے گھر پہونچنے کے بعد رضیہ بیگم کے گھر ممبئی پہونچ جاتی ہیں۔ جو خود ایک چکلے کی مالکہ تھی مگر چھمی بیگم اس کے بزنس سے انجان اس کے حلال رزق میں راضی بہ رضا رہتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر انسان دوست دل اور لطیف و نازک جذبات و احساسات کی مالک تھیں۔ اس لیے وہ عورتوں کے دکھ، درد سے بخوبی واقف تھیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے سے عورتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے بلکہ اس میں اتنا درد بھر دیا ہے کہ قاری کا دل بھی اس سے سسک اٹھتا ہے۔ چھمی بیگم کی محرومیوں کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے صرف تاریخی، تمدنی اور تہذیبی ادوار کی نمائندگی نہیں کی ہے اور نہ ہی اپنے وسیع علم کے ذریعہ سے کچھ ایسی چیزیں پیش کی ہیں کہ ان کے افسانے اکتسابی علمیت کے جہان بے معنی کے خلاف نظر آئیں بلکہ ان کے افسانے کچھ یوں علمیت کی سرحد کو عبور کرتے ہیں کہ ان میں ٹیس، کسک، اور لامتناہی غموں کا ایسا سلسلہ نظر آتا ہے، جو قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

چاہے وہ گھر کے اندر ہو یا گھر کے باہر، چاہے وہ سماج کی ذمہ داری ہو یا حکومتی سربراہوں کی مرہون منت۔ قرۃ العین حیدر نے ''آوارہ گرد'' میں حکومتی سربراہوں پر طنز کیا ہے۔ جس میں 'اوٹو' کی ماں پولینڈ کی فوجوں کا نشانہ ہوس بنتی ہے۔ یہ افسانہ یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس سے قرۃ العین حیدر کے گہرے مطالعے اور فنی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں عورتوں کی عفت و پاکدامنی کو ان محافظوں کے ہاتھوں تار تار ہوتے ہوئے دکھایا جو پولینڈ کے محافظ تھے اور طرہ یہ کہ انھیں محافظوں میں سے ایک محافظ کی بیوی 'اوٹو' کی ماں تھی، جو پولینڈ کے ہی محاذ پر مارا گیا تھا۔ سعادت حسن منٹو نے 'کھول دو' میں جس طرح سکینہ کی عزت کو اپنے ہی رضا کاروں کے ہاتھوں داغدار ہوتے ہوئے پیش کیا ہے۔ اسی طرح قرۃ العین حیدر نے دوسری جنگ عظیم میں ان عورتوں کو پیش کیا ہے جو اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں برباد ہوئیں۔ جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں، خود ایک محافظ ہی ایک عورت کی عزت کو تار تار کرتا ہے۔ عورتوں کے لیے یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے؟ عورت ان محافظوں کے ہاتھوں لٹ رہی ہے، برباد ہو رہی ہے جو کہ عورتوں کی عزت کا محافظ ہوتا ہے۔ جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، جب وہی محافظ راون بن جائے تو پھر سیتا کو کون بچا سکتا ہے؟ جب باغ کا مالی ہی گلچیں بن جائے تو مالی پر بھروسہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ''آوارہ گرد'' میں ایسے ہی مالیوں کو پیش کیا گیا ہے جو گلچیں بن کر نمودار ہوتے ہیں اور پھولوں کو ڈالیوں سے جدا کر کے پاؤں تلے روندنے کے لیے زمین بوس کر دیتے ہیں' آوارہ گرد' کا مرکزی کردار سیاح 'اوٹو' ایک ایسی ہی روندی ہوئی شخصیت کا بیٹا ہے، جو اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں زخمی کی جاتی ہے۔ 'اوٹو' دنیا کا سفر کرنے کے لیے نکلا تھا، وہ کولون یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور ایران، ترکی، جرمن، سے ہوتے ہوئے ممبئی پہنچا تھا۔ سفر کے دوران پیسے کی کمی کے باعث صرف کیلے پر ہی گزارہ کر لیتا تھا یا تو بھوکا ہی رہ جاتا تھا۔ ممبئی میں راوی کے گھر ڈائیننگ ٹیبل پر کھانے کی تعریف کرتے ہوئے اپنی ماں کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کی یاد میں المناک ہو جاتا ہے، پھر یہاں ایک عورت اور ایک مظلوم ماں کی داستان رقم ہوتی ہے۔ یہ قرۃ العین حیدر کی خوبی ہے کہ وہ اپنے مقصد کو بیان کرنے کے لیے کسی نہ کسی تکنیک کا سہارا لے لیتی ہیں۔ ان کی تکنیک کارگر بھی ہوتی ہے 'اوٹو' کی زبانی ان کی نسائی حسیت کا پتہ چلتا ہے:

> ''میرے ابا فوجی افسر تھے۔ اماں سترہ سال کی تھی، جب انھوں نے ابا سے شادی کی۔ ابا پولینڈ کے محاذ پر مارے گئے۔ ان کے مرنے کے دوسرے مہینے میں پیدا ہوا۔ بمباری سے بچنے کے لئے مجھے کندھے سے لگائے اماں جانے کہاں کہاں گھومتی رہیں۔ وہ مجھے گود میں اٹھائے، سر پر رومال باندھے، فل بوٹ پہنے اپنا مختصر سا سامان پریمبولیٹر میں ٹھونسے گاؤں گاؤں پھرتی تھیں اور کھیتوں کھلیانوں میں چھپتی رہتی تھیں۔ اماں پولینڈ میں ایک گاؤں میں چھپی ہوئی تھیں جب پولش فوجی اس رات اس مکان میں گھس آئے۔ میں اس وقت پورے چار سال کا تھا۔ میرے بچپن کی واضح ترین یاد اس قہرناک رات کی ہے۔ میں ڈر کر پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ جب افسروں نے میری اماں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو میں زور زور سے رونے لگا۔ وہ اماں کو گھسیٹ کر باہر کھیتوں میں لے گئے۔''

(افسانہ آوارہ گرد، افسانوی مجموعہ روشنی کی رفتار، ص: 9)

عورت چاہے کسی بھی ملک میں ہو، وہ کسی بھی زمانہ میں ہو، ہر

معاشرے میں اس کی نازک عصمت کا مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔ جس کی آواز قرۃ العین حیدر کے مذکورہ افسانے میں سنائی دیتی ہے کہ عورت ہندوستان میں ہو یا یورپ میں ہر جگہ وہ اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں داغدار کی جاتی ہے۔ عورت کے لیے اس سے بڑا مسئلہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ عورت ہمیشہ سے پامالی کی زندگی گزارتی آئی ہے، چاہے وہ گھر کے اندر ہو یا گھر کے باہر، معاشرتی سطح پر ہو یا خانگی سطح پر۔ شوہر کی مرہون منت ہو یا اعلیٰ عہدوں پر فائز افسروں کے زیر سایہ ہو، کوئی بھی سائبان اس کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ ''اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے'' کے نسوانی کردار 'جمال آرا' کو دیکھا جاسکتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار حیات فانی کی سختیوں کو جھیلتے ہوئے اپنے جینے کی راہیں تلاش کر لیتے ہیں۔ کہیں وہ آزادی کو ترجیح دیتے ہیں اور کہیں زنداں کو، کہیں وہ بے بس، مجبور نظر آتے ہیں تو کہیں مجبوری کو خیر آباد کہتے ہوئے نظر آتے ہیں، کہیں جمود کے شکار ہوتے ہیں تو کہیں متحرک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر اپنے مخصوص تاریخی اسلوب اور عمدہ تکنیک کے لیے انفرادیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ جوان کے وسیع مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور فکری رویے کا شاہد ہے۔ وہ عورتوں کی آزادی کی بہت قائل نہیں ہیں، کیوں کہ وہ ماڈرن اور قدامت پرست ماحول کی امتزاجی پیداوار تھیں اس لیے معتدل رویوں کی حامل بھی تھیں۔ مگر ان کی تحریروں میں نسوانی حسیت کے عنصر، ان کا باغی پن، تانیثی شعور کی جھلکیاں عورتوں کے مسائل کی بازگشت سنائی دیتی رہتی ہیں۔ ان کے اس طرز تحریر کے پس پردہ عورتوں کے مسائل اور ان کی مظلومیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ چاہے ان کی تخلیق آٹھویں صدی کے عہد عتیق کے حوالے سے ہو یا جدیدیت کے تناظر میں ''سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات'' ایسی ہی نسوانی بغاوت کو پیش کرتا ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں الیگزینڈر کی بہن ہوتی ہے اور اس کو اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے پر ممانعت کر دی جاتی ہے۔ اس کی سزا کے طور پر اس کو صحرائے سوریا کی خانقاہ کے حجرے میں محبوس کر کے ایک راہبہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

❒❒❒

Noorus Sabah
Payare Pura Amco Store
Maunath Bhanjan
Mau-275101 (U.P)

فرہنگ آصفیہ سے

عُقولِ عَشرہ۔ ع۔ اسم مذکر۔ دسوں فرشتے کیونکہ حکما کے نزدیک کل دس فرشتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اس طرح پیدا کیا۔ اول صرف ایک فرشتہ کو مخلوق فرمایا اس کے بعد ایک اور فرشتہ اور آسمان پیدا کیا یہاں تک کہ ایک ایک فرشتہ اور ایک ایک آسمان پیدا کر کے نو آسمان اور دس فرشتے پیدا کر دئے اور دسویں فرشتے نے خدا تعالیٰ کے حکم سے تمام جہان پیدا کیا۔

کعبتین۔ ع۔ اسم مذکر:۔ کعب کا تثنیہ (۱) دو مربعہ ہڈی کے شش پہلو پانسے جن کے ہر پہلو پر ایک سے لے کر چھے تک بندیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں ان سے چوسر اور جوا کھیلا جاتا ہے۔ ان میں تین پہل چھکّے کے اور تین پہل پو کے ہوتے ہیں۔ چھے خال کا پہلو چھکّا پلب نحال کا پنجہ چار خال کا چوک ایک خال کا پو دو خال کا دو تین خال کا تری کہلاتا ہے اس میں ایک سان خالوں کے آنے پر ہار جیت ہوتی ہے ہر دفعہ دو پانسے پھینکے جاتے ہیں اگر ان میں چوک چوک یا پو پو دونوں میں یکساں آجائے تو وہی بازی تر جائے۔ غرض جگ آنے پر بازی موقوف ہے۔

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے   ذوق

(۱) ہر دو کعبہ۔ یعنی مکہ معظمہ اور بیت المقدس۔ اس صورت میں کعبہ یا کعبت کا تثنیہ ہے۔

گلانچ۔ ا۔ اسم مؤنث۔ چھلانگ۔ زغند۔ چوکڑی۔ جست۔ کودپھاند۔ طفرہ۔ (اگرچہ لوگ اسے ہندی خیال کرتے ہیں مگر چونکہ ہندی میں اس کے مادے کا پتا نہیں لگتا اور نہ قدیم ہندی تصانیف میں پایا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ترکی ہے اور عجب نہیں جو قُلاج سے بنا لیا ہو کیونکہ اس کے معنی ترکی زبان میں کسی چیز کو مثل کمان زور سے کھینچنا آتے ہیں اور جست کرنے میں اپنے تمام جسم کو زور کے ساتھ دوسری طرف اچھال کر لے جانا پڑتا ہے پس اس لحاظ سے یہ معنی لے لئے ہوں تو کچھ بیجا نہیں)۔

کُسُوف۔ ع۔ اسم مذکر:۔ سورج گرہن۔ زمین اور سورج کے درمیان چاند کا آجانا۔ جب ہلال کے وقت چاند زمین کے مدار سے اپنے قطر کی نسبت کم بلندی یا پستی پر ہوتا ہے۔ تو وہ آفتاب کے ایک حصہ کو زمین کے ایک حصہ سے چھپا لیتا اور سورج گرہن یا کسوف کہلاتا ہے۔ اگرچہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ آفتاب کی روشنی جاتی رہی۔ مگر درحقیقت زمین کی روشنی جاتی رہتی ہے۔ اور چاند کا سایہ اُس کے اوپر آجاتا ہے۔

رخسار پروین

اردو کی اولین نسائی آواز: رشیدۃ النساء بیگم

1857 کی جنگ آزادی جسے غدر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے برصغیر ہندو پاک کا ایک عظیم واقعہ ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور اس جنگ آزادی میں مغلوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا جس کے سبب عوام وخواص کی زندگی بے حد متاثر ہوئی اور ہندوستانیوں کے زوال کا آغاز ہوا۔ انیسویں صدی کے ہندوستانی سماج کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی سماج اپنی بے حسی اور بے عملی کے سبب تنزلی کا شکار اور مغربی سماج اپنی بیداری کے سبب ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ غرض یہ کہ انیسویں صدی کا زمانہ ہندوستان کی مفلوک الحالی کا زمانہ تھا۔ اس دور کے ہر طبقے کی حالت ابتر تھی، اس سماج کا ہر طبقہ مرد ہو یا عورت، بداخلاقی، جہالت، بدعنوانی اور ریاکاری کا مرقع تھا۔ بے حیائی، غلط رسم و رواج غرض یہ کہ تمام طرح کی برائیاں اس عہد میں رائج تھیں۔ جہالت کا دور دورہ تھا اور تعلیم محض امیروں اور رئیسوں کی جاگیر تھی۔ غریب اور نچلے طبقے خصوصاً عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کا حق نہیں تھا۔ اگر اس دور کی عورت کا تصور کیا جائے تو گھر کی چار دیواری میں مقید علم و عقل سے بے بہرہ اور زندگی کے مسائل سے بے خبر اور محض دوئم درجے کی مخلوق نظر آتی ہے۔ سماج میں ہندو مسلم خواتین ذلت و رسوائی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ ان کو مرد اساس سماج میں اپنے کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ مردوں کو دیوتا بنا کر پوجنا، ان کی خواہشات پوری کرنا اور ان کے مرنے کے بعد ستی ہوجانا (یعنی چتاؤں کے ساتھ جل جانا) ہی ان کی قسمت تھی۔ ایک طرف جہیز کی لعنت نے جہاں اس کی زندگی کا دائرہ تنگ کیا وہیں ستی کی رسم نے عورت سے جینے کا حق بھی چھین لیا۔ بیوہ عورت کی زندگی تمام رنگوں اور خوشیوں سے خالی تھی اور بے چارگی کی زندگی اس کا نصیب بن جاتی تھی۔ نہ وہ دوسری شادی کرسکتی تھی اور نہ کسی کی شادی اور خوشیوں میں شامل ہوسکتی تھی۔ غریب خاندان کی عورتیں محنت، مزدوری کر کے گھر کے اخراجات پورے کرتیں اور مرد محض مے نوشی اور جواخوری میں بدمست رہتا اور اس کے باوجود بھی وہ عورتوں پر ظلم و ستم کرنے کے لیے آزاد تھا گویا کہ یہ اس کا عینی حق تھا۔ ڈاکٹر تاراچند "تاریخ تحریک آزادی ہند" میں لکھتے ہیں کہ ولیم برفورس لندن کی پارلیمنٹ میں جون 1813 کی رپورٹ میں ہندوستان کے متعلق کہتا ہے:

> "ہمارا مذہب ارفع و اعلیٰ پاکیزہ اور اچھا ہے ان (ہندوستانیوں) کا مذہب رکیک، عیاشانہ اور ظالمانہ ہے....
> اس دوران (1793 سے 1813) جو کچھ سنا اور پڑھا ہے اس نے ہندوستان کے متعلق برے خیالات میں اضافہ کردیا ہے۔"

(تاریخ تحریک آزادی ہند، از ڈاکٹر تاراچند، جلد دوم، صفحہ 206)

اس طرح مختلف تاریخ نگاروں نے اس دور کی عورتوں کے حالات اور ان کے مسائل کی تصویر کشی کی ہے۔ ڈاکٹر تاراچند خود لکھتے ہیں:

> "ان (ہندوستانی مردوں) کے نزدیک عورت کھیلنے کے لیے ایک گڑیا تھی اور انسان کی شہوت کو آسودہ کرنے کا ایک ذریعہ، وہ اپنی خود انفرادی شخصیت رکھنے والی ہستی نہ تھی۔ اس لیے صحیح

محبت کی چیز نہیں بن سکتی تھی۔" (جلد اول، صفحہ 274)

عورت کے ہر عمل اور سوچ پر مرد کی اجارہ داری ہوتی تھی اور یہی نہیں بلکہ تعلیم شعور و آگہی حاصل کرنے کو عورتوں کی آوارگی اور بدکرداری سے جوڑا جاتا تھا۔ اس دبی کچلی بے چاری عورت کی زندگی کا واحد مقصد محض بچے پیدا کرنا اور بچوں کی تربیت کرنا تھا۔ اس وقت بال وواہ (बाल विवाह) کی رسم عام تھی۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے بے چاری بچے سنبھالتی نظر آتی تھی۔ عورت کے منفی روپ اور اس کے متعلق یک طرفہ تصورات انیسویں صدی تک محدود رہے اور کیا پتہ کب تک محدود رہتے لیکن 1857 کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے برصغیر ہندوپاک پر باقاعدہ قبضہ کر لیا اور یہ ایسا انقلاب اور اتنا بڑا سانحہ تھا کہ اس سے پہلے رونما نہ ہوا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ زمانے میں نئے تغیرات، نئی تہذیب، نئے حالات، نئی شورش، نئے احکامات اور نئی مشکلات رونما ہوئیں۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی اور ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ بھی۔ اس جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں جدید مغربی تہذیب و تمدن کا آغاز ہوا اور زندگی نے اس نئے ماحول میں نئی کروٹ بدلنی شروع کی۔

چنانچہ حالات کے تقاضے کے تحت اور بدلتے ماحول کا سامنا کرنے کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت تھی اور چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے لہٰذا اس ضرورت نے ایسی پرآشوب گھڑی میں بہت سی عظیم شخصیات و رہنماؤں کو جنم دیا جنھوں نے اس بدلتے ہوئے ماحول کو محسوس کیا اور نئے حالات سے نپٹنے کے لیے مختلف تجاویز کیں اور قوم کو نئی راہوں پر گامزن کیا۔ ان رہنماؤں میں سرسید احمد خاں، راجہ رام موہن رائے، دیانند سرسوتی، ایشور چندودیا ساگر، گاندھی جی اور ولزلی کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنی مساعی سے اصلاحی تحریکوں کو جنم دیا اور ملک و قوم میں شعور و بیداری پیدا کی۔ راجہ رام موہن رائے نے "ستی" کی رسم کے خلاف آواز اٹھائی تو دیانند سرسوتی نے ہندو مذہب کے احیاء کے لیے اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کیا۔ سرسید نے تعلیم نسواں کا نعرہ بلند کیا اور ہندوستان کی شناخت قائم رکھنے کے لیے عورتوں کی تعلیم اور شعور و بیداری پر زور دیا۔ اسی طرح ایشور چندودیا ساگر نے بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کرانے کی پرزور حمایت کی اور مہاتما گاندھی اور وویکانند نے عورتوں کی آزادی کی بات کی اور "بال وواہ" یعنی کم عمر میں لڑکیوں کی شادی کی مخالفت بھی کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان رہنماؤں نے اپنی اصلاح کے ذریعہ ہندوستان میں پھیلی ہوئی ایسی تمام برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کیں اور ان میں شعور و بیداری کا احساس پیدا کیا۔

اس طرح مختلف تحریکوں نے ہندوستان میں تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلیاں پیدا کیں اور آہستہ آہستہ انگریزی تہذیب و تمدن نے معاشرے کو تیزی سے تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ عورتوں کے حقوق آزادی اور تعلیم نسواں وقت کی اہم ضرورت بن کر ادب کا موضوع بنے۔

سرسید تحریک کے ایک اہم رکن مولوی نذیر احمد نے سب سے پہلے عورتوں کے حوالے سے ایسے ادب کا آغاز کیا جس میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق بات کی جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے 1869 میں اپنا پہلا ناول "مراۃ العروس" لکھا جس میں اصغری اور اکبری کے حقیقی کرداروں کے ذریعہ عورتوں کی اصلاح کا کام لیا گیا۔ حالی نے "مجالس النساء" دو جلدوں میں لکھی اس کے علاوہ بھی بہت سے ناول لکھے گئے جن میں عورتوں کی تعلیم، مشہور و معروف علوم کے متعلق بنیادی باتیں، خواتین کے مسائل و توہمات اور رسم و رواج کی اصلاح پر خصوصی توجہ دی گئی۔

بلاشبہ یہ اردو کے اولین قصے تسلیم کیے جاتے ہیں جس میں عورتوں کے مسائل پیش کیے گئے اور اصغری و اکبری اور مریم زمانی جیسے نسائی کرداروں پر ان کی عمارت تعمیر کی گئی۔ خصوصاً نذیر احمد کے ناولوں نے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح میں نہایت اہم رول ادا کیا جس نے آگے چل کر عورتوں میں بھی ایک نئی بیداری اور شعور پیدا کیا جس کی بنیاد پر ان میں اظہار کی مختلف پنہاں صورتیں نمایاں ہوئیں۔ اور اب عورتوں نے خود بھی اپنے مسائل باقاعدہ طور سے پیش کرنے شروع کر دیے۔ چنانچہ نذیر احمد نے عورتوں کی وکالت کا جو کام شروع کیا اسے اب خود عورتوں نے شروع کر دیا جس کے ذریعہ نئے نئے مسائل و موضوعات نمایاں ہوئے اور مختلف قصے اردو ادب کی زینت بنے۔

اردو ادب میں بہ حیثیت خاتون ناول نگار رشیدۃ النساء بیگم نے اپنا ناول "اصلاح النساء" پیش کیا۔ یہ پٹنہ صوبہ بہار سے تعلق رکھتی تھیں۔ رشیدۃ النساء اردو کی پہلی باقاعدہ ناول نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کا پہلا معاشرتی، اصلاحی اور مقصدی ناول لکھا جو کہ 1894 میں منظر عام پر آیا۔ مصنفہ نے اس ناول کے دیباچے میں ذکر کیا ہے کہ اس کا مسودہ تیرہ برس یوں ہی پڑا رہا۔ اس لحاظ سے اس کا سن تصنیف 1881 شمار کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ زمانہ ایسا تھا جہاں عورتوں کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے ان کے لیے اپنی کہانیوں کو چھپوانا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ خاص طور سے مسلم معاشرے کی شہزادیوں کے لیے نام ہی کیا آواز تک کا پردہ ہوا کرتا تھا۔ ایسے ماحول میں انھوں نے پہلے پہل لکھنا شروع

کیا اور ''اصلاح النساء'' میں اپنا تعارف اصل نام کے بجائے اس طرح کرایا ہے: ''والدہ محمد سلیمان بنت سید وحید الدین خاں وہمشیرہ امداد امام اثر'' بعض محققین نے ان کا دوسرا نام خدیجۃ الکبریٰ بھی بیان کیا ہے۔ رشیدۃ النساء اردو کے مشہور و معروف محقق امداد امام اثر کی بہن تھیں۔

''اصلاح النساء'' مسلم گھرانوں میں پھیلی برائیوں اور مسلمان خواتین کی اصلاح کے لیے ہی تحریر کیا گیا۔ یہ ایک مقصدی ناول ہے جس کا خاص مقصد مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط اور لغو رسم و رواج توہمات اور روایات و حکایات کی اصلاح وانسداد تھا۔ بلاشبہ یہ ناول مولوی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' سے متاثر ہو کر اور اس کی پیروی میں لکھا گیا لیکن اس ناول کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں عورت کی جدوجہد کو گھر کی چاردیواری تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ عورتوں کی بیداری اور حقوق کی بھی بات کی گئی ہے۔ نذیر احمد کے اعتراف میں ایک جگہ رشیدۃ النساء لکھتی ہیں:

''اللہ مولوی نذیر احمد کو عاقبت میں بھی بڑا انعام دے۔ ان کی کتاب پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ جہاں تک ان کو معلوم تھا انہوں نے لکھا اور اب جو ہم جانتے ہیں اس کو انشاء اللہ تعالیٰ لکھیں گے۔ جب اس کتاب کو لڑکیاں پڑھیں گی تو مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ سب اصغری ہو جائیں گی۔ شاید سو میں سے ایک اپنی بدقسمتی سے اکبری رہ جائے تو رہ جائے۔''

بے علمی کے سبب مسلم معاشرے میں غلط رسم و رواج، شرک و بدعت اور بری رسومات و روایات پیدا ہو چکی تھیں ان سے خواتین کا طبقہ زیادہ شکار ہو رہا تھا۔ خصوصاً مسلمان گھرانوں کی عورتیں گمراہی کی حد تک جا پہنچی تھیں۔ اس وقت سماج میں جو بدلاؤ ہو رہے تھے خصوصاً نئی تعلیم، ٹکنالوجی اور نئی روشنی کی بدولت سماج میں جو تبدیلی ہو رہی تھی اس سے مرد طبقہ تو براہ راست مستفیض ہو رہا تھا لیکن عورتیں جو گھر کی چاردیواری میں مقید تھیں اس نئی روشنی سے بے خبر تھیں ان کو یہ موقع نہ ملا تھا۔ لہٰذا رشیدۃ النساء بیگم نے عورتوں کے تمام مسائل اور خامیوں پر مبنی ناول ''اصلاح النساء'' لکھ کر ان عورتوں کی اصلاح کی کامیاب کوشش کی۔ غالباً رشیدۃ النساء نے نذیر احمد کی طرز پر ہی اپنے ناول میں مقصدیت کو پیش نظر رکھا اور کرداروں کو بھی اپنے مقصد کے مطابق دو حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی خیر و شر کے زمرے میں، ایک حصہ بے انتہا خوبیوں کا مالک بن گیا اور دوسرا سراسر خامیوں سے لبریز۔ ایک طبقہ ترقی پسند اور دوسرا رجعت پسند بن کر سامنے آیا۔ مثلاً امتیاز الدین کی والدہ اور گھر والے فرسودہ رسوم و روایات کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے جبکہ دوسری طرف بسم اللہ کا خاندان ہر طرح کی بدعات و شرک میں مبتلا ہوتا ہے۔ چونکہ مصنفہ کو رجعت پسندی کو غلط اور برا ثابت کرنا ہے اسی لیے انھوں نے یہ نقشہ کھینچا ہے کہ بسم اللہ اور اس کی والدہ زمانے بھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اور اپنے ہاتھوں پیدا کیے ہوئے برے اور ناخوش گوار حالات سے گھبرا کر بالآخر شر سے خیر کی جانب مراجعت کرتی ہیں۔ رشیدۃ النساء بیگم کا کہانی لکھنے کا یہ انداز نذیر احمد کے جیسا ہی ہے۔ یہاں اس قصے کے کرداروں کے نام بھی نذیر احمد کے انداز بیان سے کافی مماثلت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر محمد واعظ، اشراف النساء وغیرہ۔ ان بنیادی خامیوں کے باوجود بھی رشیدۃ النساء کا یہ ناول فنی طور پر نذیر احمد کے ناولوں سے کہیں زیادہ بہتر درست اور بھروسے کے لائق ہے کیونکہ مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں محض سادہ و سپاٹ قصے اور وعظ و نصیحت کے علاوہ کسی طرح کی کوئی تہذیبی و معاشرتی منظر کشی نہیں ملتی جبکہ رشیدۃ النساء کے یہاں اس زمانے کی مکمل منظر کشی خصوصاً نسوانی زندگی کے ہر پہلو کی ماہرانہ و فنی طور پر زور بیان اور قوت مشاہدہ کے ساتھ منظر کشی کی گئی ہے جس کی داد دیے بغیر قاری آگے نہیں بڑھ سکتا۔ علی الخصوص یہ ان کی فنی مہارت اور قوت مشاہدہ کا بہترین نمونہ ہے اور اسی سے متاثر ہو کر اردو کے مشہور و معروف نقاد پروفیسر وقار عظیم نے نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' پر رشیدۃ النساء کے قصے ''اصلاح النساء'' کو فوقیت دی ہے۔

''اصلاح النساء'' اس دور کا ایسا ذخیرہ و گنجینہ ہے جس میں زمانے کی خصوصاً عورتوں کی تمام اوہام اور رسوم و روایات کا ذکر مکمل طور پر پیش کیا گیا ہے۔ رشیدۃ النساء کی گھریلو زندگی پر بہت گہری نظر تھی اور اسی لیے انھوں نے اس ناول میں اپنے مشاہدات و تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور بہترین منظر کشی کی ہے اور کردار نگاری و جزئیات نگاری کی ایسی شاندار مثال پیش کی ہے کہ نذیر احمد کا ناول بھی اس کے سامنے پھیکا نظر آتا ہے۔ انھوں نے کرداروں کو ایک اچھا نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ نذیر احمد کے کردار آئیڈیل، غیر حقیقی اور جامد ہوتے ہیں جبکہ رشیدۃ النساء کے کردار حقیقت پر مبنی اور سماج کے جیتے جاگتے افراد ہیں۔ امتیاز الدین کا کردار ہیرو کا ہے اور عورتوں کے کردار میں بسم اللہ اور وزیرن پوری کہانی میں چھائی ہوئی ہیں۔ دوسری جانب لاڈلی اور سردار دلہن کے کردار کے ذریعہ انھوں نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی ہے اور انھیں کرداروں نے اس ناول کو کامیابی سے سرفراز کیا۔ ان کے کرداروں میں زندگی کی حرکت اور چہل پہل ملتی ہے۔ اسی طرح نچلے طبقے کے مختلف کردار ہیں جو اس ناول کی رونق ہیں جن کے ذریعہ کہانی اپنے انجام تک پہنچتی ہے مثلاً دھوبن، مامائیں، چوڑی والی، پنڈت اور ملا، کمہارن، تیلن باجے والی وغیرہ قابل

ذکر ہیں۔ ناول کا سب سے اہم اور پُر جوش کردار وزیرن کا ہے، جس کے ذریعہ مصنفہ نے اس عہد میں پھیلی ہوئی غلط رسومات، توہمات اور واہیات رسموں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ یہ کردار خرافات، بیہودہ باتوں، واہیات رسموں، ٹونہ ٹوٹکے اور تعویذ گنڈوں کے امید و بھروسے زندہ نظر آتا ہے۔ ناول میں وزیرن کا کام غیر تعلیم یافتہ اور توہم پرست عورتوں کو بہکا کر جھوٹے فقیروں و پیروں کے پاس لے جا کر ان سے پیسے حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا اس کردار کے ذریعہ مصنفہ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح غریب جاہل عورتوں کو بہلا پھسلا کر انھیں غلط رسومات میں مبتلا کر دیا جاتا تھا جس کی انھوں نے مذمت بھی کی ہے اور اصلاح بھی۔ وہ ترقی پسند خیال کی حامل تھیں اور سماج میں پھیلی برائیوں کو دور کرنا چاہتی تھیں۔ عورتوں کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتی تھیں تاکہ وہ جہالت اور فرسودہ رسومات سے خود کو بچا سکیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ہمارے معاشرے کی عورتوں میں موجود ان تمام خرابیوں اور برائیوں کا اصل سبب ان میں تعلیم کی کمی ہے، جس کی وجہ سے معاشرہ غلط عقائد و نظریات اور غلط رسومات و توہم پرستی میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا انہیں برائیوں کو دور کرنے کے لیے وہ عورتوں کو تعلیم یافتہ کرنا چاہتی تھیں اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئیں اور رشیدۃ النساء کے انہیں تعلیمات نے عورتوں اور لڑکیوں میں جہالت سے دور رہنے اور تعلیم کے حصول کی ایک جرأت و دلیری کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔

''اصلاح النساء'' میں رشیدۃ النساء نے جہیز پر بھی لعن طعن کی ہے اور اس کی پرزور مخالفت کی ہے جو اس زمانے کے لحاظ سے ایک عورت کے لیے بہت ہی دلیرانہ اور جرأت مندانہ قدم تھا، لیکن انھوں نے کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنا قلم اٹھایا اور تیکھا طنز کیا۔ اس کے علاوہ دیگر فرسودہ رسومات و روایات اور شرکت و بدعت پر بھی گہرا طنز کیا ہے۔ علاوہ ازیں زمانے میں پھیلی دیگر برائیوں اور بہت سی حرکتوں کو غیر اسلامی قرار دے کر پند و نصیحت کے ذریعہ اصلاح کی مکمل کوشش کی ہے مثال کے طور پر ایک گیت کے کچھ بول پیش کیے جا رہے ہیں جو شادی بیاہ کے موقع پر گائے جاتے تھے جس میں شرک کے کلمات جا بجا ملتے ہیں اور اس پر کتنی خوبی سے انھوں نے طنز و اصلاح کی ہے:

اللہ میاں کا چھرا رنگ بھرا
میں تو دیکھت ہوں گی نہال
اے بے نیاج مجھ پر رحم کرو
کچھ رحم کرو کرم کرو
میرے پروردگار مجھ پر رحم کرو
کوٹھے بیٹھے اللہ میاں
چھجے بیٹھے اللہ میاں
پھر سہرا باندھے اللہ میاں
کنگنا باندھے اللہ میاں

اس دور میں یہ گیت شادی کے موقع پر گایا جاتا تھا اور اس کے خلاف کسی کو بولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن مصنفہ کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ دھیمے لہجے میں ایک کردار کے ذریعہ اس کی یوں مذمت کی ہے اور لوگوں کی اصلاح کی ہے۔ ناول کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ طبقۂ نسواں کی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں عورت کے مختلف رنگ و روپ، منفی و مثبت افکار و نظریات کے پیش نظر مصنفہ نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بغیر تعلیم یافتہ عورت گھر اور سماج کو جہنم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی اس لیے عورت کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ جہالت و گمراہی کے سبب جب عورت برائیوں میں گھر جاتی ہے تو اس کے زیر سایہ پرورش پانے والی نسل بھی اسی سے متاثر ہو کر ایک برے معاشرے کی تشکیل کرتی ہے۔ چنانچہ انھیں عیوب و نظریات کے پیش نظر انھوں نے اپنا یہ اصلاحی اور مقصدی ناول اصلاح النساء لکھا جس کے ذریعہ معاشرے کی عورتوں کی اصلاح ہو اور وہ صحیح راہ پر گامزن ہو سکیں۔

مختصراً یہ ناول ''اصلاح النساء'' اپنے عہد کی معاشرتی حقیقت پر مبنی ہے۔ ہر چند کہ اس کی بنیاد نذیر احمد کے ناولوں پر رکھی گئی اور اس کی اتباع میں لکھا گیا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ناول نذیر احمد کے ناولوں سے زیادہ معتبر و مؤثر ہے۔ ''اصلاح النساء'' گویا طبقۂ خواتین کے پند و نصیحت اور اصلاح و شعور کا ایک مؤثر سبب بنا۔ یہ ناول اس عہد کی بہترین تخلیق ہے، جس میں مصنفہ نے علم، شعور و آگہی کی اہمیت اور عظمت کو عیاں اور آشکار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ اس طرح رشیدۃ النساء بیگم نے اپنے اس ناول کو مشعل بنا کر عورتوں میں علم کی روشنی پھیلانے کی سعی کی اور علم کے فائدے و نقصانات پر بھی روشنی ڈالی ہے چنانچہ پہلی مصلح خاتون ہونے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

□□□

Rukhsar Parveen
Research Scholar
Department of Urdu
University of Allahabad-211002 (U.P)

یار

عصمت چغتائی

جب اکبر نے فریدہ کو ریاض سے ملایا تو ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ریاض معصوم صورت خاموش سا لڑکا تھا۔

ہم دونوں ایک ہی گلی میں کھیلے، گیند اور کبڈی کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ اتفاق سے کالج میں بھی ساتھ نہ چھوٹا۔ پھر یہ بھی بمبئی آ گیا۔ کتنا عجیب اتفاق ہے۔' اکبر نے کہا تھا۔ 'ذرا بورنگ سا انسان ہے' یہ جملہ بھی ساتھ لگا دیا تھا۔

شروع شروع میں عموماً تینوں ساتھ ساتھ رہتے۔ سینما کے تین ٹکٹ خریدے جاتے۔ ہوٹل میں تین سیٹیں ریزرو ہوتیں۔ ریاض کا وجود کچھ لازم و ملزوم جیسا ہو گیا تھا۔ پھر جوں جوں شادی پرانی ہوتی گئی اور اکبر کی مصروفیتیں بڑھتی گئیں فریدہ اور ریاض کا ساتھ بھی بڑھتا گیا۔ اکبر تو نئے دوستوں اور نئے مشغلوں میں ڈوب کر دیر سے آتے۔ ریاض سیدھا دفتر سے آ جاتا۔ چائے پی کر اخبار یا میگزین دیکھا کرتا۔ کبھی دونوں کیرم یا تاش کھیلنے لگتے۔ کبھی کسی سہیلی سے ملنے جاتی اور اکبر کو دیر ہو جاتی تو وہ ریاض کو لے جاتی۔ اکبر تو کبھی عورتوں کی غیر دلچسپ باتوں سے گھبرا کر چل بھی دیتا۔ 'تم ریاض کے ساتھ لوٹ آنا۔'

اور وہ ریاض کے ساتھ لوٹ آتی۔

شادی پرانی ہوتی گئی مگر ریاض کی اہمیت دن بدن بڑھتی گئی۔ فریدہ نے انجانے طور پر سارے شوہروں والے اوپری کام ریاض سے لینے شروع کر دیے — نوکروں کی مرمت کرنا، راشن کارڈ بنوانا، شاپنگ کے لیے ساتھ ساتھ دھکّے کھاتے پھرنا، چھوٹے موٹے خط لکھنا، بینک میں روپیہ جمع کرانا، نکلوانا اور مختلف کام کرنا۔

یہاں تک کہ جب فریدہ کا 'مس کیرج' ہوا تو خوش قسمتی سے ریاض دفتر میں مل گیا۔ اسی نے آ کر ہسپتال پہنچایا۔ اس دن اکبر کے کسی افسر کی الوداعی پارٹی تھی۔ جب وہ وہاں سے رات کو دو بجے گھر پہنچے اور بیگم کی بدحالی کا پتہ چلا تو ظاہر ہے بہت گھبرائے۔ مگر صبح کا انتظار کرنا پڑا۔ افسر کو اسٹیشن پر رخصت کر کے جب وہ ہسپتال پہنچے تو اُجاڑ صورت ریاض کو دیکھ کر اُن کا بھی رنگ اُڑ گیا۔ وہ ساری رات بنچ پر بیٹھا اونگھتا رہا تھا۔ اکبر نے اسے زبردستی آرام کرنے کے لیے بھیجا۔

انھیں ہسپتال روز جانے کی فرصت نہ تھی۔ اس لیے وہ ریاض ہی کو فون کر کے دوائیں وغیرہ خریدنے کی ہدایت دے دیتے۔ حسن اتفاق کہیے یا قسمت، جب وہ اچھی ہو گئی اور وہ اسے ہسپتال سے گھر لانے موٹر لے کر گئے تو معلوم ہوا کہ وہ صبح ہی ریاض کے ساتھ گھر آ چکی تھی۔ ریاض نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ دن بھر کے بعد جب اکبر دفتر سے لوٹے تو ریاض گھر سنبھالے ہوئے تھا۔

پھر دن گزرتے گئے، اکبر کی بے توجہی اور غیر دلچسپی نے اور بھی ذمہ داریاں ریاض کے کاندھوں پر ڈال دیں۔ وہ ابھی تک چھڑا تھا۔ دو ایک جگہ لوگوں نے شادی کرانے کی کوشش کی۔ مگر وہ ٹالتا رہا۔ 'بھئی مجھے خانہ داری کے جھگڑوں سے وحشت ہوتی ہے' وہ کہہ کر ٹال دیتا اور بات بھی خدا لگتی تھی۔ اکبر تو اسے ہمیشہ یہی نصیحت کرتے۔ 'میاں اس چکر میں نہ پھنسنا، کسی کام کے نہیں رہو گے۔ اپنی جو گت ہے وہ دیکھ ہی رہے ہو۔ شادی وبال ہے۔'

پھر بال بچے ہوئے۔ اکبر تو بچوں کی چل پوں سے گھبرا کر کلب چلے جاتے یا کسی یار دوست کے یہاں پینے پلانے کا پروگرام رہتا۔ ریاض دفتر سے سیدھے ان کے گھر جاتے۔ بچوں سے کھیلا کرتے، روتے بچوں کو شہد چٹا دیا۔ گرائپ واٹر دے دیا۔ فریدہ کو الٹے سیدھے کام لینے میں بہت مزہ آتا۔ وہ بے تکے پنے سے بچے کا نیپکن بدلتا یا نہلاتے ہیں پانی ڈالتا تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ جاتی۔ پہلے تو اسے بڑی گھبراہٹ ہوتی۔ سر سے پیر تک بھیگ جاتا۔ لیکن فریدہ منع کرتی تو کہتا۔ 'کوئی بات نہیں۔'

'اچھا ہے تم یہ کام سیکھ لو تمھاری بیوی مزے کرے گی۔' وہ ہنستی اور ریاض بھی ہنس دیتا۔ کبھی کوئی بچہ بے بات رونے لگا، فریدہ کسی دوسرے کام میں مشغول ہوتی تو وہ ریاض کو ڈانٹتی۔ 'اے ہے کیسے بے ہودہ آدمی ہو، بچہ رو رہا ہے۔ ذرا چپ کرا دو نا۔'

'اُلّو کی اولاد چپ ہی نہیں ہوتا۔'

'تو ٹوٹے ہاتھوں سے اٹھایا نہیں جاتا؟'

اور وہ بچے کو اٹھا کر اسے بہلانے کے لیے عجیب بندروں کی سی

حرکتیں کرتا۔ بچہ بہل جاتا۔

جوں جوں بچے بڑھے۔ ریاض کی ذمہ داریاں بھی بڑھیں۔ بچوں کا کس اسکول میں داخلہ کرایا جائے اون ریاض کے ایک دوست کے ذریعہ ستا مل سکتا ہے۔ شکر بلیک سے لیتی ہو تو فریدہ اور فریدہ کی ساری سہیلیوں کے لیے ریاض مہیا کرے۔ خود اکبر ان کاموں سے جی چراتے تھے۔ کبھی کوئی ایسا فلم آتا جس سے اکبر کو دلچسپی نہ ہوتی تو وہ خود کہہ دیتے بھئی تم ریاض کے ساتھ دیکھ آؤ مجھے ایسے فلموں سے دلچسپی نہیں۔

اکبر کی دلچسپیاں بہت کچھ پینے پلانے کے گرد محدود ہوتی جا رہی تھیں۔

ظاہر ہے اس صورت میں ریاض رات کا کھانا بھی یہیں کھانے لگا۔ فریدہ ان کے ساتھ بچوں کو سیر کراتی، سرکس دکھاتی، شام کو دونوں مل کر بچوں کے ساتھ کھیلتے۔ پھر بہلا پھسلا کر کپڑے بدلا کر سلا دیتے۔ اکبر کو ان جھگڑوں کے لیے فرصت نہ تھی۔ بچے بھی باپ سے بے تکلف نہ تھے۔ ریاض کے کندھوں پر چڑھ کر 'انکل انکل' کر کے پیسے مانگتے۔ نئی نئی فرمائشیں کرتے، اکبر تو فریدہ کو گھر کا خرچ دے دیتے تھے۔ 'انھیں تحفے دینے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بچے بھی جان گئے تھے۔

آندھی آئے، پانی برسے، ریاض کا آنا ناغہ نہ ہوتا اگر کسی وجہ سے وہ کسی دن نہ آ پاتے تو سارا گھر پریشان ہو جاتا۔ فریدہ بوکھلائی ہوئی پھرتیں۔ سارے پروگرام الٹ جاتے۔ خدا جانے ریاض کو کیا ہو گیا۔ بیمار تو نہیں پڑ گئے؟ کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا؟ کبھی نوکر دوڑاتیں، کبھی پڑوس میں ٹیلی فون کرتیں۔ اگر بدقسمتی سے ریاض کسی دوست کے ساتھ سنیما دیکھنے چلا گیا ہوتا تو دوسرے دن ان کی شامت آ جاتی۔

'کہاں مر گیا تھا، ذلیل، مجھے فون ہی کر دیا ہوتا تو میں اتنی پریشان نہ ہوتی۔ فلم کے ٹکٹ منگائے تھے بڑی مشکل سے واپس ہوئے، نہ ہوتے تو تمھیں پیسے بھرنا ہوتے۔'

بچے بھی پیچھے پڑ جاتے۔ 'ہم آپ سے نہیں بولتے۔ آپ کل آئے کیوں نہیں۔' جرمانے وصول کر کے ملاپ ہوتا اور وہ نہایت پابندی سے آنے لگتے۔

اگر کبھی ریاض کی طبیعت خراب ہو جاتی تو فریدہ بچوں کو لے کر ان کے گھر دھاوا بول دیتیں۔ تیمارداری کم، خود اپنی خاطر زیادہ کرواتیں۔ ان جھگڑوں سے جان چھڑانے کے لیے ریاض بیمار ہوتے ہی ان کے گھر آن پڑتے۔

اور پھر ایسا ہی ہونے لگا کہ اگر کسی دن غلطی سے اکبر دفتر سے سیدھے گھر آ جاتے تو بچے اور بیوی گھبرا جاتے کہ ان پر یہ کیا مصیبت ٹوٹ پڑی جو یوں آنا پڑا۔ فریدہ اور ریاض کا پروگرام لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ سنیما کے دو ٹکٹ ہوتے تو پھر تیسرا کہیں الگ ملتا اور تکلفاً ریاض کو الگ بیٹھنا پڑتا۔ مارے شرمندگی کے مزہ کرکرا ہو جاتا کہ روز تو اس کو وہ جہاں چاہے گھسیٹ لے جاتی ہے ایک دن شوہر نامدار پھاند پڑیں تو اس غریب کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جائے۔

کھانے پر بھی گڑبڑ مچ جاتی۔ عموماً اکبر کے لیے میز پر پلیٹ لگائی ہی نہیں جاتی تھی۔ رات کو دو ڈھائی بجے پی کر آتے تو اپنے کمرے ہی میں کھانے کی ٹرے منگوا لیا کرتے تھے۔ جس دن وہ جلدی آ جائے تو ایسا معلوم ہوتا، کوئی مہمان بے وقت ٹپک پڑا ہو۔ جلدی جلدی ان کے لیے جگہ بنائی جاتی۔ ریاض جو عموماً فریدہ کے قریب ہی بیٹھا کرتا تھا تاکہ بچوں کو کھانا دینے میں مدد دی جائے، آخری کرسی پر دور جا بیٹھتا۔ بچے حیرت سے اسے دیکھتے۔ فریدہ کو بڑی کوفت ہوتی۔ کیونکہ اکبر بالکل اجنبیوں کی طرح کھلاتا۔ فریدہ کو اکیلے ہی بچوں کو سنبھالنا پڑتا۔ اگر اکبر کچھ مدد کرنے کی کوشش بھی کرتے تو بدمزگی پیدا ہو جاتی۔

'ارے رے، یہ اتنے چاول اس کی پلیٹ میں بھر دے۔ مارو گے کمبخت کو؟ یوں بھی اسے کھانسی ہے۔ دہی نہ دو۔ ارے یہ چٹنی تو بچوں کی تھی۔ تم نے ختم کر دی۔' اور اکبر مجرم سے رہ جاتے۔

'ریاض بیٹھے بیٹھے خود ٹھونس رہے ہو، اتنا نہیں ہوتا کہ بچوں کو بھی دے دو۔ میرے دو ہاتھ ہیں۔ کیا کیا کروں؟' وہ ڈانٹتی۔ اور ذرا سی دیر میں ریاض پوری میز کا چارج لے لیتا۔ نہایت حساب کتاب سے وہ کھانا تقسیم کر دیتا۔ کسے کون سی بوٹی پسند ہے۔ آج کس کی گودے کی ہڈی کی باری ہے۔ گردہ کسے ملے گا۔ کسے رائتہ ملے گا، کسے سوپ، پھر کسی کو ڈرانا ہے۔ کسی کو پھسلانا ہے۔ کون ذرا سی ڈانٹ دے دی۔ تو ساری میز لوٹ پوٹ کر ڈالے گا۔ کون ڈانٹ کے بغیر بھوکا بسورتا رہ جائے گا۔

پھر وہ لطیفے اور چٹکلے۔ روٹی کی کہانی۔ بوٹی کا قصہ۔ مرچوں کے چٹپٹے واقعے۔ اکبر کو کیا معلوم؟ وہ تو ریاض کو ہی ازبر تھے، وہ ان کے نجی مذاق جو باہر والے کی سمجھ میں نہیں آ سکتے تھے۔ اور اکبر باہر والے تھے۔ لومڑی کی دعوت میں سارس کی طرح حونق اور اکتائے ہوئے کھانا زہر مار کرتے رہتے۔

اکبر دہلی نہیں جا سکتے تھے۔ چھٹیاں تو تھیں، مگر ان دنوں کرکٹ میچ ہو رہے تھے اور وہ میچ کے دیوانے تھے۔ کبھی ریاض بھی ان میچوں کا دیوانہ تھا۔ مگر چونکہ فریدہ کو ان سے وحشت ہوتی تھی۔ اس نے کہہ کر دلچسپی

چھڑادی۔ میچ آتے تو اسے ایسا معلوم ہوتا اس کی جان پر سوتن آگئی۔ اس لیے اس نے عجیب وغریب چالیں چل کر ریاض سے یہ میچ چھڑائے۔ وہ ان دنوں ہلکوں کے پروگرام بنالیتی۔ سنیما کے ٹکٹ خرید لیتی، ہر وقت میچ کی برائیاں کرتی۔ ڈنٹسٹ سے وقت مقرر کرلیتی۔ بغیر محسوس کیے ریاض کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ ہاں سوئمنگ کا شوق قائم رہا۔ حالانکہ فریدہ کو پانی سے ڈر لگتا تھا مگر وہ بچوں کے ساتھ جاتی۔ ریاض بچوں کو تیرنا سکھایا کرتا اور وہ کنارے بیٹھی سوئٹر بنا کرتی۔

شروع شروع میں اُس نے اکبر کے لیے سوئٹر بنے مگر انھوں نے وہ سوئٹر خاص طور پر ان دوستوں کو دے دیے جو فریدہ کو زہر لگتے تھے۔ ریاض کے پاس بیس بیس برس پرانی چیزیں سینتی رکھی تھیں۔ ہر سال وہ ایک نئے سوئٹر کے ساتھ پرانے سوئٹر کی بھی مرمت کردیتی۔

اس کے باوجود اکبر اور فریدہ میاں بیوی تھے۔ ان کے بچے پیدا ہو رہے تھے۔ وہ ایک ہی گھر میں، ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ ان کے پلنگوں کے درمیان صرف ڈھائی فٹ کا فاصلہ تھا۔ ظاہر ہے بچوں کو لے کر فریدہ کے اکیلے دہلی جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا— مجبوراً ریاض کا بھی ٹکٹ خریدا گیا۔

فریدہ اپنے بھائی کے گھر میں ٹھہریں۔ بھائی بھابی میرٹھ کسی دوست کی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ اپنے دونوں بچوں کو چھوڑ گئے تھے۔ دہلی میں خوب مزے کیے۔ خوب سیریں کیں پچھلی مرتبہ اکبر کے ساتھ آنا ہوا تھا۔ انھیں باہر جانے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ سرِ شام ہی سے لوگ 'شغل' کے لیے جمع ہوجاتے۔ بڑی چہل پہل رہتی۔ مگر بچے ساتھ نہیں تھے۔ وہ انھیں ریاض کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ بالکل نئے سرے سے ہنی مون کا لطف آگیا تھا۔ مگر کبھی بچوں کی یاد آکر مزہ کرکرا کردیتی— بچوں کو جو ریاض کی نگرانی میں چھوڑ گئی تھی۔ مگر اب کی دفعہ بچے ساتھ تھے۔ اکبر کی غیر حاضری اس نے بارہا محسوس کی— مگر اب تو کچھ عادت سی پڑ چکی تھی۔

ریاض نے خوب سیریں کرائیں۔ تصویریں کھینچیں، فریدہ کی اور بچوں کی۔ ہنستی ہوئی، کھلکھلاتی ہوئی۔ کبھی فریدہ کہتی 'ریاض تم بھی تو آؤ۔ کسی سے کہو بٹن دبا دے' اور ریاض بھی فریدہ کے قریب آجاتا— آس پاس بچے ہوتے۔

بھائی کے بچے منو اور شہنہ جو پہلی مرتبہ فریدہ کے بچوں سے ملے تھے۔ ریاض کو انکل کہتے اور بڑے گھل مل گئے۔ مگر ایک دن شہنہ نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ 'تم اپنے ڈیڈی کو انکل کیوں کہتے ہو؟'

'کسے؟'

'انکل ریاض کو—'

'مِسلی— انکل ریاض ہمارے انکل ہیں'

'اچھا؟ یہ تمھارے ڈیڈی نہیں—؟' شہنہ نے معصومیت سے پوچھا۔

اور بچوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ 'انکل یہ آپ کو ہمارا ڈیڈی سمجھتی ہیں۔' 'اُلّو کہیں کی'

ریاض کھسیانہ ہوکر ہنسنے لگا۔ فریدہ کو بھی ہنسی آگئی۔

'تو کیا تو میری بیٹی نہیں؟—؟' ریاض نے کہا۔

'مگر—' بچی کی سمجھ میں نہ آیا اپنا مطلب کیسے واضح کرے۔

'جا بھنگن تو میری بیٹی نہیں— اب مانگنا چاکولیٹ'

'اوں— بیٹی ہوں آپ کی—' بچی اس کے گلے سے جھول گئی۔

فریدہ کی سہیلی نے دعوت کی۔ بچوں کا کیا کیا جائے۔

'کل الا بلا کھانے سے گلے میں درد ہو رہا ہے— تم چلی جاؤ میں بچوں کو دیکھ لوں گا—؟' ریاض نے سر کا بوجھ ہلکا کردیا۔ فریدہ خوشی خوشی تیار ہوئی مگر جانے سے پہلے اسے غرارے کے لیے پانی دیا۔ پنسلین کی گولیاں چوسنے کی ہدایت کی' بچوں کے بارے میں احکامات جاری کیے اور بن سنور کر جانے لگی۔

'افوہ— تمھاری اس یرقان زدہ ساڑھی سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ قسم خدا کی ایک دن اسے جلا دوں گا۔' ریاض نے پلنگ پر لیٹے لیٹے پکارا۔

'اونھ آپ کون ہوئے—' اس نے ٹالنا چاہا۔ مگر قدِ آدم آئینہ میں دیکھا تو ایسا لگا ریاض ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ساڑھی بدل ڈالی۔

پارٹی شاندار رہی۔ سب نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔ یہ بتاتے ہوئے اسے کچھ جھجک محسوس ہوئی کہ وہ میچ کی وجہ سے نہیں آئے۔ کسی کو کچھ بتایا، کسی کو کچھ۔ بات ٹال دی۔

'بچوں کو ریاض پر چھوڑ آئی ہوں، پریشان کر رہے ہوں گے۔' سہیلی نے روکا تو فریدہ نے کہا۔

'بھئی آپ خوب ہیں— میاں سے بچے پلواتی ہیں۔' سہیلی کے میاں نے شکایت کی۔

'مگر میرے میاں تو بمبئی میں ہیں۔'

'آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بچے ریاض پر چھوڑ آئی ہوں۔'

'اے ہے ڈارلنگ— ہاؤ سلی۔ فری کے ہسبینڈ کا نام تو اکبر ہے۔'

سہیلی نے بات صاف کی۔

'اوہ — اور ریاض — ؟'

اکبر کے بچپن کے دوست بلکہ بھائی ہی سمجھئے۔'

'بلکہ اکبر ہی سمجھ لیجئے تو کیا حرج ہے؟' زوردار قہقہہ پڑا۔

فریدہ کو ذرا کوفت ہوئی۔ کتنے چیپ ہیں یہ لوگ — اُنھ لعنت!! انھیں کون سمجھائے۔ کئی بار لوگوں نے غلطی سے ریاض کو اس کا شوہر سمجھ لیا۔ اُسے برا نہ لگا ضرور وہ لوگ نہایت احمق سے لگے۔ انھ، کیا ہوتا ہے ان باتوں سے۔ کیا بگڑتا ہے۔ مگر بات زیادہ سنورتی نہ معلوم ہوئی تو اس کی سہیلی نے کہا۔ 'ریاض کی شادی زینت سے کیوں نہیں کروا دیتیں؟'

'ارے بھئی کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کمبخت سے۔ سنتا ہی نہیں، مذاق میں ٹال دیتا ہے'

'تم کہو تو ضرور مانے گا — '

'تو تمھارا مطلب ہے میں نے اس سے نہیں کہا؟' فریدہ جلی۔

'نہیں ذرا زور ڈالو۔'

'میں کیسے زور ڈالوں — کوئی بچہ ہے کہ پچھاڑ کر دوا پلا دوں' وہ اور بگڑی۔

'اے ہے، اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔'

'میں تو خاک نہیں بگڑتی — ' فریدہ نے بہت ہی بگڑ کر کہا۔

'اچھا جانے دو' سہیلی اپنی جان چھڑا کر بھاگی۔ فریدہ کھسیاتی رہ گئی۔ لوگ سمجھتے ہیں وہ ریاض کی شادی نہیں ہونے دیتی۔ اسے ریاض پر غصہ آنے لگا۔ اس نے کتنی بار کہا کہ کمبخت شادی کیوں نہیں کرتا۔ ہمیشہ ٹال دیتا ہے۔

'ارے ہٹاؤ — '

'کیا جاہلوں کی سی باتیں کرتی ہو۔'

'بھئی میں جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا' اور وہ بچوں کے ساتھ اودھم مچانے لگا یا ڈانٹ کر ان کو ہوم ورک کروانے لگتا۔ ان کی رپورٹ پر غور کرتا۔ استادوں سے ملتا یہ بے چارے اکبر کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ بے دیکھے دستخط کر دیتے اور کہہ دیتے۔

'ریاض سے کہو اچھی طرح دیکھ لے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'

ایک دن ریاض بڑے غصہ میں باہر سے آیا اور فریدہ کو ڈانٹنا شروع کیا۔ 'کچھ ہوش بھی ہے صاحب زادی ابھی سے پیر نکال رہی ہیں — نہ جانے کن لونڈوں کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ میرا تو قسم خدا کی خون کھول گیا۔'

'میرا تو کہنا ہی نہیں مانتی — فریدہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

'نہیں مانتی تو ٹھوکو چڑیل کو۔ نہیں تو میں ٹھوکوں گا۔'

'مار پیٹ سے کیا ہوگا — ؟' پھر دونوں گھنٹوں بچوں کی نفسیات کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتے رہے۔ دونوں میں سے کسی کو خیال بھی نہ آیا کہ اس معاملہ میں اکبر کی رائے بھی لی جائے۔ کیا فائدہ، بیکار پریشان ہو جائیں گے۔ ان کی شراب نوشی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ذرا سی بات پر بہت ہی پریشان ہو جاتے تھے اور پھر سب کی زندگی حرام ہونے لگتی تھی۔

دہلی کی سیر ہو چکی تھی بچوں کی چھٹیاں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ فریدہ کو بھائی بھاوج کا انتظار تھا کہ آجائیں تو ان سے مل کر جائے۔

'اکبر نہیں آئے — ؟' انھوں نے آتے ہی حیرت سے پوچھا۔

'انھیں کچھ کام تھا — ' فریدہ صفا جھوٹ بول گئی۔

'اور باہر کمرے میں کون ٹھہرا ہوا ہے؟'

'ریاض'۔ فریدہ نے لاپروائی سے کہا۔ مگر اسے ڈر لگنے لگا۔

'ریاض — یعنی وہ تمھارے ساتھ یہاں بھی آیا ہے؟'

'ہاں — مگر — ' فریدہ ان کے لہجہ سے چونکی۔

'میں ان حرکتوں کو قطعی پسند نہیں کرتا' وہ غرائے۔

'اے ہے جانے بھی دیجئے۔ بھابی نے سمجھایا' باہر آواز جائے گی۔'

'آواز جائے گی تو جانے دو۔ میں کسی حلال زادے سے ڈرتا ہوں؟ شرم نہیں آتی — اب تو بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ تمھارے یہ گُن دیکھ کر وہ کیا سیکھے گی۔ تم اکبر کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ مگر مجھے اُلو نہیں بنا سکتیں — دنیا تمھارے جنم میں تھوک رہی ہے۔'

'جنم میں تھوک رہی ہے؟' فریدہ نے سوچا۔

'اکبر جیسا بے شرم انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیا اسے کچھ نظر نہیں آتا؟'

'کیا نظر نہیں آتا — ؟ فریدہ نے اور سوچا۔

'مگر تمھاری یہ ہمت کہ تم میرے گھر میں غلاظت پھیلا رہی ہو — '

'غلاظت...... سوچتے سوچتے فریدہ کی کنپٹیاں جھنا گئیں۔

'اپنے یار کو ساتھ لیے پھرتی ہو؟' بھابی نے بہت روکا۔ مگر وہ کہہ ہی گئے۔

'یار!' فریدہ کا جی چاہا زور کا قہقہہ لگائے۔ ریاض اس کا یار ہے۔ مگر ہنسی اس کے گلے میں سسک کر رہ گئی۔ بیس برس زن زن کرتے نظروں میں گھوم گئے — یار! دنیا کی نظروں میں ریاض اس کا یار نہیں تھا، تو پھر کون تھا......؟ اور وہ چپ چاپ اٹھ کر سامان باندھنے لگی۔

□□□

راز

وفا یزداں

گذشتہ سات برسوں سے ایک فور اسٹار ہوٹل میں ریسپشنٹ کی ذمہ داری ادا کر رہا ہوں، ان برسوں میں میری آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے واقعات انجام پائے۔ ہر ایک کا بیان کرنا چاہوں تو دو ہزار و پانچ سو کے لگ بھگ کہانیاں میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ ٹریجڈی، کامیڈی، عاشقانہ، مزاحیہ، جس طرح کی فرمائش کی جائے میں بیان کرنے کو تیار ہوں۔ کبھی رخصتی اور ولیمہ کے مراسم کے لیے پورے ہوٹل کی بکنگ ہوتی ہے اور دولہے اور دلہن کے رشتہ دار اور دوست دوسرے شہروں یا ملکوں سے چند دن پہلے آکر یہاں رہنے لگتے ہیں۔ ہر مہینے مختلف خاندانی پروگرام یہاں منعقد ہوتے رہتے ہیں، ایک ہی بات سب میں دیکھنے میں آتی اور وہ یہ ہے کہ سب آپس میں ملتے، گپ شپ لگاتے ہیں، عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی ہیں، بے تکلفی سے بات چیت کرتی ہیں، مگر یہی عورتیں جب تیار شیار ہو کر ایک دوسرے کے سامنے ہوتی ہیں تو ان کے ملنے نیز چلنے کا رنگ ڈھنگ اور طرح کا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں ان کو مشکل سے پہچان پاتا ہوں: اکثر ان کے بچوں سے یا ان کے میاں جو ان کے ساتھ ہوتے ہیں کی وجہ سے جان پاتا ہوں کہ اچھا یہ وہی خاتون ہے!! میک اپ میں بھی کیا جادو ہے!! میں حیران و ششدر رہ جاتا ہوں کہ یہ جادو صرف روپ کو نہیں بدلتا یہ کیسا اثر ہے کہ ان کے چلنے کا، بات کرنے کا حتیٰ دیکھنے کا طور طریقہ بھی بالکل بدل جاتا ہے۔ کان ذرا نزدیک کریں، ہلکی سی آواز میں آپ کو بتاؤں کہ ان میں بس دکھاوا ہی دکھاوا نظر آتا ہے۔ جو سب سے مہنگا لباس پہنی ہوتی ہے وہ عورت سب سے زیادہ منہ چڑھا چڑھا کر نخرے کرتی نظر آرہی ہوتی ہے۔ میاں بیوی ہنی مون کرنے آتے ہیں، سب سے زیادہ ترس ان پر آتا؛ دونوں ہنستے کھیلتے یہاں قدم رکھتے ہیں ایسا لگتا کہ وہ غم روزگار سے ناواقف ہیں۔ تیسرے دن سے ٹریجڈی کی کیفیت شروع ہو جاتی ہے۔ لڑکی کی سوجی ہوئی آنکھ اور لڑکے کا سینہ نکال کر چلنا خوشی کے دو دن میں سوگواری کی خبر دیتا ہے۔ میں نے لڑائیوں کی ہر طرح کی آواز اور تلخ الفاظ سنے ہیں، نئے نئے محاورات انہی سے سیکھے ہیں؛ جو اس سے پہلے کی زندگی میں کبھی بھی نہیں سنے تھے! کبھی ہمارے ہوٹل میں سیمینار کے مندوبین یا میچ کے کھلاڑی ٹھہرتے ہیں۔ ان کا بھی اپنا اپنا حال ہوتا ہے، اکثر بغیر میاں یا بیوی کے ساتھ آتے ہیں۔ سچ بتاؤں، جتنے دن ان کا یہاں ٹھہراؤ ہوتا ہے، وہ دن بھر مسکراتے رہتے ہیں۔ شروع سے آخر تک کوئی بل اور سلوٹ ان کے چہرے پر نہیں آتی اور نہ ہی روپ میں کوئی بناوٹ آتی ہے۔ علمی میدان سے وابستہ لوگوں کی بھی اپنی اپنی دنیا ہوتی ہے! کسی کے بغل میں اپنی تحریر شدہ کتاب یا اس کی صدارت میں نشر کیا ہوا رسالہ! یہی سرمایہ ایک دوسرے کو دے رہے ہوتے ہیں! ہر کسی کی جیب سے ویزیٹنگ کارڈ نکل آتا ہے! پہلی دفعہ ایک دوسرے سے ملتے وقت ویزیٹنگ کارڈ کا تبادلہ ہوتا ہے! عورت کا انوکھا پن یہاں نمایاں ہوتا ہے! جتنی عورت حسین ہو اس کے پاس ویزیٹنگ کارڈ کا ہجوم آپڑتا ہے بلکہ ایک ہی شخص کئی بار اپنا ویزیٹنگ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے! ایک بات کہتا چلوں مگر آپ نظر انداز کر دیں، ان لوگوں کی رخصتی کے بعد ہمارے ملازم کمروں سے ان کی چھوڑی ہوئی کتابوں کو کوڑے کی نذر کرتے ہیں! یہ سب سخن بس تمہید ہی سمجھیں۔ اب میں آپ کی توجہ دلاتا ہوں ایک تاریخی دن پر: سات نومبر۔۔۔۔۔

سات نومبر کو جو میں نے دیکھا اور سنا وہ ان سب سے الگ ایک ایسا منظر تھا جو ایک معما بن کر میرے دماغ کو اذیت دے رہا ہے۔ دوپہر کے ڈھائی بجے میں کمپیوٹر پر لگا ہوا تھا، ایک زنانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی میری نظر ایک ایسی عورت پر پڑی کہ میں مبہوت ہو کر رہ گیا! ایسا لگا میری زبان پر تالا لگا دیا گیا ہو؛ مشکل سے اس کو جواب دیا وہ جو بولی؛ ای کسکیوزمی سر! میں بولا جی۔۔۔ جی، فرمائیے! اللہ نے بہت سی عورتوں کو حسن سے مالا مال کیا ہے مگر یہ عورت حسین ہونے کے علاوہ نہایت پر کشش شخصیت کی بھی حامل تھی۔ سنجیدہ تو تھی مگر ساتھ ساتھ فرشتوں جیسی معصوم اور مہربان نظر آرہی تھی۔ میں اس کے سامنے یوں کھڑا ہوا، جیسے کسی نے زبردستی مجھے پکڑ کر کھڑا کر دیا ہو۔ " آج رات مجھے آپ کے ہوٹل میں رہنا ہے"۔ اس نے آمرانہ لہجے میں یہ جملہ کہا۔

" کیا آپ کی بکنگ ہو چکی ہے؟ نام بتائیے پلیز"۔ ابھی وہ جواب نہیں دے پائی تھی کہ میں نے کہا" بکنگ نہیں بھی ہوئی تو کوئی بات نہیں خوش قسمتی سے کئی کمرے خالی ہیں"۔ حالانکہ ہم عام طور پر فوراً نہیں کہتے

تاکہ ہمارے ہوٹل کی عزت خراب نہ ہو۔ نا چاہتے ہوئے میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔ اس نے کہا" افراتفری میں آئی ہوں اور پہلے سے اطلاع نہیں دے سکی لیکن مجھے کمرہ نمبر 1014 میں ٹھہرنا ہے۔" اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ آمرانہ لگا۔ میں نے کمروں کی فہرست چیک کر کے افسوس کا اظہار کیا۔" سوری میڈیم یہ کمرہ خالی نہیں۔ اسی فرسٹ فلور میں دوسرا کمرہ خالی ہے۔ آپ اس میں رہ سکتی ہیں۔"

" وہی کمرہ چاہیے۔ جو بھی اس میں رہ رہا ہے اس سے بات کیجئے، وہ دوسرے کمرے میں شفٹ ہو جائے۔" وہ نہایت بے پروائی سے بات کر رہی تھی۔ اس کو خشک اور منفی جواب دینا میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے کمرے کا نمبر ملایا اگرچہ ہم ایسا نہیں کرتے لیکن اس عجوبہ عورت کے سامنے ہر انہونی بات ہونی ہو رہی تھی۔ آپ مانیے اگر کوئی بھی میری جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔ سننے والے کے سامنے عورت کی درخواست رکھی گئی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا، اس درخواست نے اس کی ناک میں دم کر دیا۔ "یہ کیا مذاق ہے، تمھاری ہمت کیسے ہوئی!!" اس کی ساتھ والی خاتون کی بڑبڑاہٹ اس کے غصے میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔" میں افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے اس عورت کے سامنے اپنی ناکامی کا اظہار کر رہا تھا کہ اس نے حکم دیا کہ اس شخص کو نیچے بلائیں۔ میں نے بس اس عورت کا پیغام کمرے میں مقیم شخص کو دیا اور اس آدمی نے نہایت سخت غصے میں بس اتنا کہا کہ اچھا میں آ رہا ہوں اور دیکھوں گا آپ دونوں کو! میں ڈر گیا اور اپنے منیجر کی ڈانٹ ڈپٹ کے خوف نے مجھے مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔ لیکن میں اس عورت کی خواہش کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا اور بلا وجہ میرا دل اس کے حق میں گواہیاں دے رہا تھا کہ یہ کمرہ اسی کا ہے اور جس نے بھی اس پر قبضہ کیا ہوا ہے وہ اس کمرے کو اس کے مالک کو واپس دے دے۔ اس عورت اور کمرے میں مقیم مرد کا جھگڑا متوقع تھا۔ اس طرح کے ماحول نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ لڑائی جھگڑے کی توقع تھی میں ان بھیانک تصورات میں گم تھا کہ لفٹ سے ایک بھاری بھر کم آدمی باہر آیا۔ عورت آرام سے کرسی پر بیٹھے ہوئے باہر کے منظر پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو عورت کی طرف متوجہ کیا۔ مرد اس کی طرف تیزی سے بڑھا" جی اب بتائیے کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" عورت نے نزاکت سے اس کی طرف دیکھ کر اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مرد کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں اور اس کا چڑچڑاپن کافی حد تک دور ہو گیا۔ میں حیران تھا عورت کے چہرے پر التجا کی کوئی نشانی نہیں جھلکتی تھی۔ وہ اپنے خوبصورت ہاتھ ہلا کر خوش ادائیگی سے بولتی جا رہی تھی۔

فاصلہ اتنا تھا کہ مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، ان کے قریب جانے کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا، مگر اس کی بولتی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے دلائل پیش کر رہی تھی۔ مرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھتا رہا اور بار بار سر نیچے اوپر کر کے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ مرد کی اس بے وقوفی پر مجھے غصہ بھی آیا! اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو اس کی بات ماننے سے مسلسل انکار کرتا رہتا تاکہ وہ بات کرتی رہے اور میں لطف اٹھاتا رہوں۔ عورت کھڑی ہو کر سلسلہ ختم کرنا چاہ رہی تھی مگر مرد بے دلی سے اپنے پاؤں پر آہستہ سے کھڑا ہو گیا، لگتا تھا وہ ابھی مزید بیٹھ کر عورت سے گفتگو کرنے کا خواہشمند تھا۔ مرد نے میری طرف آتے ہوئے کہا:" اسی فلور میں کوئی اور خالی کمرہ ہے تو ہم اس میں شفٹ ہو جائیں گے، نہیں تو دوسرے فلور میں شفٹ کر دیں۔" میں عورت سے نظر ہٹانا نہیں چاہتا تھا، میں ہکا بکا رہ گیا کہ اس کے چہرے پر کوئی فاتحانہ انداز بھی نظر نہیں آ رہا تھا ایسا لگتا تھا کہ اس کو پکا یقین تھا کہ وہ اپنی پسند کے کمرے میں شفٹ ہو جائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ بات چیت کے دوران اس نے کوئی بناوٹی ادا نہیں دکھائی۔ وہ سنجیدگی سے بولتی جاتی اور آخر میں ہلکی سی مسکراہٹ اس کے منہ پر آ گئی، بس ایک خوشی کی لہر موجزن ہوئی!!

" اچھا میڈیم مبارک ہو، آپ کی خواہش پوری ہوئی۔ اب یہ فارم بھر دیجیے۔۔۔ میڈیم آپ یہاں کی رہائشی نہیں لگتیں!! آپ کے لہجے سے ایسا لگتا ہے کہ آپ باہر پلی بڑھی ہیں۔۔ آپ کہاں۔۔۔۔" اس نے نیم نگاہ میری طرف ڈال کر ایسی بے التفاتی اختیار کی جیسے بتا رہی ہو؛ اپنے کام سے کام رکھو!! مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ جب تک وہ فارم بھرتی رہی مجھے اس کی جانچ پرکھ کا خوب موقع ملا۔ لمبی پلکیں، بلند ماتھا، ابھرے ہوئے رخسار، کمان جیسے ابرو، لمبی گردن اور اکڑا ہوا اسٹائل اس کی گردن کو مزید خوبصورت بنا رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ قدرت نے بڑے ماہرانہ انداز سے اس کی پیکر تراشی کی ہے، اس نے ایسا لباس پہنا ہوا تھا کہ اس کی پتلی سی کمر اور موزوں ٹانگیں اور بازو نظروں سے چھپی نہ رہیں؛ اس کی شائستگی اور وقار بھی ساتھ ساتھ نمایاں تھا، مگر ظاہری روپ سے زیادہ اس کی چال ڈھال، برتاؤ اور نسوانیت سے میں اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ میرے اوسان اس وقت بجا ہوئے جب اس نے فارم میری طرف بڑھا دیا۔ جب تک وہ مرد دوسرے کمرے میں شفٹ ہوتا اور عورت کو کمرہ الاٹ ہوتا؛ میں بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا کہ اس عورت سے بات کروں مگر بے فائدہ!! اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر میں نے کہا' میں نے صحیح کہا تھا نہ کہ آپ کی رہائش یہاں نہیں؛۔۔۔ مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ

تاکہ ہمارے ہوٹل کی عزت خراب نہ ہو۔ نا چاہتے ہوئے میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔ اس نے کہا" افراتفری میں آئی ہوں اور پہلے سے اطلاع نہیں دے سکی لیکن مجھے کمرہ نمبر 1014 میں ٹھہرنا ہے۔" اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ آمرانہ لگا۔ میں نے کمروں کی فہرست چیک کر کے افسوس کا اظہار کیا۔" سوری میڈیم یہ کمرہ خالی نہیں۔ اسی فرسٹ فلور میں دوسرا کمرہ خالی ہے۔ آپ اس میں رہ سکتی ہیں۔"

" وہی کمرہ چاہیے۔ جو بھی اس میں رہ رہا ہے اس سے بات کیجئے، وہ دوسرے کمرے میں شفٹ ہو جائے۔" وہ نہایت بے پروائی سے بات کر رہی تھی۔ اس کو خشک اور منفی جواب دینا میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے کمرے کا نمبر ملایا اگر چہ ہم ایسا نہیں کرتے لیکن اس عجوبہ عورت کے سامنے ہر انہونی بات ہونی ہو رہی تھی۔ آپ مانیے اگر کوئی بھی میری جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔ سننے والے کے سامنے عورت کی درخواست رکھی گئی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا، اس درخواست نے اس کی ناک میں دم کر دیا۔ " یہ کیا مذاق ہے، تمھاری ہمت کیسے ہوئی!!" اس کی ساتھ والی خاتون کی بڑبڑاہٹ اس کے غصے میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔" میں افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے اس عورت کے سامنے اپنی ناکامی کا اظہار کر رہا تھا کہ اس نے حکم دیا کہ اس شخص کو نیچے بلائیں۔ میں نے بس اُس عورت کا پیغام کمرے میں مقیم شخص کو دیا اور اس آدمی نے نہایت سخت غصے میں بس اتنا کہا کہ اچھا میں آرہا ہوں اور دیکھوں گا آپ دونوں کو! میں ڈر گیا اور اپنے منیجر کی ڈانٹ ڈپٹ کے خوف نے مجھے مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔ لیکن میں اس عورت کی خواہش کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا اور بلا وجہ میرا دل اس کے حق میں گواہیاں دے رہا تھا کہ یہ کمرہ اسی کا ہے اور جس نے بھی اس پر قبضہ کیا ہوا ہے وہ اس کمرے کو اس کے مالک کو واپس دے دے۔ اس عورت اور کمرے میں مقیم مرد کا جھگڑا متوقع تھا۔ اس طرح کے ماحول نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ لڑائی جھگڑے کی توقع تھی میں ان بھیانک تصورات میں گم تھا کہ لفٹ سے ایک بھاری بھر کم آدمی باہر آیا۔ عورت آرام سے کرسی پر بیٹھے ہوئے باہر کے منظر پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو عورت کی طرف متوجہ کیا۔ مرد اس کی طرف تیزی سے بڑھا" جی اب بتائیے کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" عورت نے نزاکت سے اس کی طرف دیکھ کر اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مرد کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں اور اس کا چڑچڑا پن کافی حد تک دور ہو گیا۔ میں حیران تھا عورت کے چہرے پر التجا کی کوئی نشانی نہیں جھلکتی تھی۔ وہ اپنے خوبصورت ہاتھ ہلا کر خوش ادائیگی سے بولتی جا رہی تھی۔

فاصلہ اتنا تھا کہ مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، ان کے قریب جانے کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا، مگر اس کی بولتی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے دلائل پیش کر رہی تھی۔ مرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھتا رہا اور بار بار سر نیچے اوپر کر کے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ مرد کی اس بے وقوفی پر مجھے غصہ بھی آیا! اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو اس کی بات ماننے سے مسلسل انکار کرتا رہتا تا کہ وہ بات کرتی رہے اور میں لطف اٹھاتا رہوں۔ عورت کھڑی ہو کر سلسلہ ختم کرنا چاہ رہی تھی مگر مرد بے دلی سے اپنے پاؤں پر آہستہ سے کھڑا ہو گیا، لگتا تھا وہ ابھی مزید بیٹھ کر عورت سے گفتگو کرنے کا خواہشمند تھا۔ مرد نے میری طرف آتے ہوئے کہا:" اسی فلور میں کوئی اور خالی کمرہ ہے تو ہم اس میں شفٹ ہو جائیں گے، نہیں تو دوسرے فلور میں شفٹ کر دیں۔" میں عورت سے نظر ہٹانا نہیں چاہتا تھا، میں ہکا بکا رہ گیا کہ اس کے چہرے پر کوئی فاتحانہ انداز بھی نظر نہیں آرہا تھا ایسا لگتا تھا کہ اس کو پکا یقین تھا کہ وہ اپنی پسند کے کمرے میں شفٹ ہو جائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ بات چیت کے دوران اس نے کوئی بناوٹی ادا نہیں دکھائی۔ وہ سنجیدگی سے بولتی جاتی اور آخر میں ہلکی سی مسکراہٹ اس کے منہ پر آگئی، بس ایک خوشی کی لہر موجزن ہوئی!!

" اچھا میڈیم مبارک ہو، آپ کی خواہش پوری ہوئی۔ اب یہ فارم بھر دیجیے۔۔ میڈیم آپ یہاں کی رہائشی نہیں لگتیں!! آپ کے لہجے سے ایسا لگتا ہے کہ آپ باہر پلی بڑھی ہیں۔۔ آپ کہاں۔۔۔۔" اس نے نیم نگاہ میری طرف ڈال کر ایسی بے التفاتی اختیار کی جیسے بتا رہی ہو؛ اپنے کام سے کام رکھو!! مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ جب تک وہ فارم بھرتی رہی مجھے اس کی جانچ پرکھ کا خوب موقع ملا۔ لمبی پلکیں، بلند ماتھا، ابھرے ہوئے رخسار، کمان جیسے ابرو، لمبی گردن اور اکڑا ہوا اسٹائل اس کی گردن کو مزید خوبصورت بنا رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ قدرت نے بڑے ماہرانہ انداز سے اس کی پیکر تراشی کی ہے، اس نے ایسا لباس پہنا ہوا تھا کہ اس کی پتلی سی کمر اور موزون ٹانگیں اور بازو نظروں سے چھپی نہ رہیں؛ اس کی شائستگی اور وقار بھی ساتھ ساتھ نمایاں تھا، مگر ظاہری روپ سے زیادہ اس کی چال ڈھال، برتاؤ اور نسوانیت سے میں اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ میرے اوسان اس وقت بجا ہوئے جب اس نے فارم میری طرف بڑھا دیا۔ جب تک وہ مرد دوسرے کمرے میں شفٹ ہوتا اور عورت کو کمرہ الاٹ ہوتا؛ میں بہانہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اس عورت سے بات کروں مگر بے فائدہ!! اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر میں نے کہا 'میں نے صحیح کہا تھا نہ کہ آپ کی رہائش یہاں نہیں'۔۔ مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ

قطرہ قطرہ دریا ہوتا ہے

زیب النساء حیا

ہماچل کی حسین وادیوں میں ایک گاؤں تھا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہاں آس پاس کے درختوں کے ساتھ چھوئی موئی کے لاتعداد پودے ہیں، اتنا سننا تھا کہ وہاں قدیمی رہنے والے ننھے میاں نے فوراً بوریا بستر باندھا اس سوچ کے ساتھ چاہے کچھ بھی ہو جائے اس گاؤں سے چھوئی موئی کے پودے ضرور لا کر رہیں گے اور پھر ان پودوں کو بیچیں گے بھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے خاصی آمدنی بھی ہوگی اور اس درخت سے ان کی زندگی بھی بدل جائے گی ایسا کیوں سوچا انھوں نے؟ آیئے اس کا بھی خلاصہ کرتے چلیں۔ ننھے میاں بہت ہی بھولے اور صاف دل کے انسان تھے۔ ایک دن ان کے دوست نے مذاق ہی مذاق میں کہہ دیا، ننھے میاں میں نے سنا ہے جس گھر میں چھوئی موئی کا پودا لگا ہو اس گھر میں کبھی دکھ نہیں آتا......! خوشیاں ہی خوشیاں برستی ہیں۔ بس پھر کیا تھا ننھے میاں کو ایک ہی دھن سوار ہوگئی اب چاہے جو کچھ بھی ہو جائے چھوئی موئی کا پودا لا کر ہی رہیں گے۔ بہت ڈھونڈنے کے بعد معلوم ہوا یہ خوش نصیب پودا ہماچل کے ایک گاؤں میں بڑی آسانی سے مل جائے گا۔ ننھے میاں روٹی، گٹھری اور ایک لوٹا لے کر سفر پر نکل پڑے۔ سفر طویل تھا مگر ننھے میاں کو اس سفر سے کوئی گلہ نہ تھا، ہوتا بھی کیسے خواب آنکھوں میں سجے ہوں تو پھر کانٹوں بھرے راستے کو بھی انسان بڑی آسانی سے پار کر جاتا ہے، کچھ گھنٹوں کے بعد ننھے میاں ہماچل کے اس گاؤں میں پہنچ چکے تھے۔

اب دیکھیے کیا ہوا؟ وہاں پہنچے تو ہر درخت کو چھو کر دیکھتے ہیں کہ کون سا چھوئی موئی کا پودا ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے چھوئی موئی کے پودے کی خاصیت۔ اس کو ہاتھ لگاتے ہی وہ مرجھا جاتا ہے۔ یعنی سمٹ جاتا ہے اس کی پتیاں بند ہو جاتی ہیں، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہاتھ لگاتے ہی اپنی اصل شکل سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ننھے میاں کی تلاش پوری ہوئی۔ بڑے درختوں کے بیچ چھوئی موئی کا پودا انھیں اب مل ہی گیا۔ اس کو دیکھ کر مت پوچھیے ان کا حال دل بس ایک ہی سانس میں بولے، اب دکھ کے دن بیتے..........! دراصل یہ لفظ ان کا تکیہ کلام تھا۔ چھوئی موئی کو ہاتھ میں لیا اور چل پڑے اپنے گھر کی جانب......! راستے بھر چھوئی موئی دوسری شکل میں رہا وجہ جانتے ہی ہیں اس کو ہاتھ لگاتے پر وہ سمٹ جاتا ہے۔ وہ اس وقت ننھے میاں کے ہاتھ میں جو تھا۔

گھر پہنچے آنگن میں چھوئی موئی کے پودے کو رکھا اور بولے، کل سے میری نئی صبح ہوگی۔ کیونکہ تم بہت خوش قسمت ہو، میں اسی لیے تو تمھیں یہاں لایا ہوں۔ یہ کہہ کر ننھے میاں مارے خوشی کے اپنے کمرے کی طرف بڑھے مگر افسوس یہ بھول گئے کہ اس پودے کو ٹھیک سے کیاری یا گملے میں لگا دیتے جیسے وہ اسے اکھاڑ کر پنّی میں باندھ کر لائے تھے، ویسے ہی اسے وہاں رکھ چھوڑا......! بس خوشیوں کی تلاش مکمل ہوئی اس دیوانگی نے انھیں یہ تک بھلا دیا تھا کہ زمین سے اکھڑا پودا زیادہ دیر زندہ نہیں رہتا اگر اسے ٹھیک سے دوبارہ مٹی کے ساتھ نہ سینچا جائے۔ کیونکہ ہم انسانوں کی طرح وہ بھی سانس لیتے ہیں، مگر کہتے ہیں انسان جنم سے ہی خود غرضی کا لباس پہن کر پیدا ہوا ہے۔ اسے صرف اپنی خوشیوں کی اور اپنے آپ کی فکر ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے بس جو کچھ بھی ہو سب میرا ہو۔ بہرحال بھولے سے صاف دل ننھے میاں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کی لاپرواہی سے ایک جیتا جاگتا سانس لیتا پودا حالات کی آندھی میں فنا ہو جائے گا۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ ایسی سچائی اور نیکی کس کام کی جو کسی کی پرواہ نہ کرے۔

اب رات ہوئی ننھے میاں نے کھانے پینے سے فارغ ہو کر اپنا بستر سنبھالا، ویسے انھیں ہمیشہ سے سونے کی جلدی اس وجہ سے رہتی تھی کہ وہ رات کے تیسرے پہر یعنی 3 بجے عبادت میں مشغول ہو جایا کرتے تھے۔ یہ ان کا برسوں پرانا شغل تھا۔ آج بھی انھوں نے یہی کیا۔ تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن میں مصروف ہو گئے۔ فجر کا وقت ہوا روشنی کی کرنیں پھوٹیں، چڑیوں کی چہچہاہٹ نے انھیں احساس دلایا کہ اب اٹھو۔ دنیا کے کاموں کو انجام دو ننھے میاں......! بس پھر کیا تھا فوراً انھوں نے دل کی بات سنی اور بڑھ چلے اس احساس کے ساتھ کہ

آج چھوئی موئی ان کی زندگی میں نئی صبح یقیناً لے کر آیا ہوگا، مگر یہ کیا......!! جیسے ہی چھوئی موئی کے پودے پر نظر پڑی ان کے خواب تو ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گئے۔ ان کے منھ سے بے ساختہ نکلا یاالٰہی......!! یہ کیا ہوا چھوئی موئی کا پودا تو ختم ہوگیا۔ وہاں کا منظر کچھ یوں تھا، چھوئی موئی جس طرح آدھا ادھورا پنّی میں بندھا تھا وہ اسی حالت میں سوکھ چکا تھا۔ اس کی جڑ میں جو مٹھی بھر مٹی تھی وہ بھی سوکھ کر کنکر ہو چکی تھی۔ یہ تو وہی بات ہوئی ’بن پانی سب سون‘ اس کہاوت سے شاید آپ آشنا ہوں۔ بہرحال یہ منظر دیکھ کر ننھے میاں کی آنکھیں بھیگ گئیں، دل ہی دل میں بولے یارب! کیسی تقدیر پائی ہے میں نے آج تک خوشیوں کی تلاش میں جتنی بھی کوشش کی سب ناکام رہی، لے دے کے دوست کے کہنے پر یہ پودا لایا مگر وہ بھی ختم ہوا۔ اب کیا کروں؟ یہ کہتے ہوئے ننھے میاں نے چھوئی موئی کے پودے کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

پر سنیے یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی......!

ایک رات وہ گہری نیند میں تھے اچانک ان کی آنکھ کھل گئی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ ذہن پر زور ڈالا تو یاد آیا کہ وہ چھوئی موئی کے پودے سے باتیں کر رہے تھے۔ دوران گفتگو وہ چھوئی موئی کے پودے کو بتا رہے تھے کہ میں کیا ہوں اور سب سننے کے بعد چھوئی موئی کے پودے نے انھیں کیا جواب دیا۔ یہ ہم آخر میں بتائیں گے۔ تو چلیے موضوع کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے آجاتے ہیں اسی جگہ چھوئی موئی کے پودے نے ان کے بارے میں جاننا چاہا تھا سو ننھے میاں بڑی گہری سانس لیتے ہوئے بولے تھے میں ایک مومن ہوں میں عدل وانصاف کو مقدس سمجھتا ہوں اور آزادی کو افضل ترین۔

انسان کے وجود کو لائق احترام تصور کرتا ہوں، کمزور کے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہوں، طاقتور کو یاد دلاتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ کوئی طاقتور ہے۔ مالدار کو نصیحت کرتا ہوں کہ بے سہارا بےکس انسان پر مال خرچ کرے۔ بھلائی کو پسند کرتا ہوں، اچھائی کی طرف لوگوں کو بلاتا ہوں۔ برائی سے انکار کرتا ہوں ہر طرح کے تشدد کو سختی کے ساتھ مسترد کرتا ہوں۔ نرمی کو پسند کرتا ہوں اور نرم مزاجی کو ترجیح دیتا ہوں۔ غلط اور بے بنیاد باتوں کی مخالفت کرتا ہوں، بگاڑ اور فساد کا خاتمہ چاہتا ہوں۔ سچائی کی تائید کرتا ہوں، حق کا ساتھ دیتا ہوں سیدھی راہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شک وشبہ والی بات کو قبول نہیں کرتا۔ جنگ ولڑائی سے نفرت کرتا ہوں، امن سے عشق کرتا ہوں، موت سے ڈرتا ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس سے گزرنا ہی پڑے گا کیونکہ فنا سے بقا کی طرف اس سے گزرے بغیر جانا ممکن نہیں۔

حسن کے خاتمہ کی تمنا رکھتا ہوں، جہنم اور جحیم والے راستے کے نفرت کرتا ہوں، نہ کسی کو ہلاک کرنا چاہتا ہوں اور نہ کسی کو برا بھلا اور نہ کسی کے ساتھ بدزبانی کرنا چاہتا ہوں۔ جنت میں لے جانے والی ہر چیز اور کام کی تلاش میں رہتا ہوں۔ میرا سلسلۂ نسب آدم اور حوا سے ملتا ہے۔ آدم میرے باپ اور حوا میری ماں ہیں اور روئے زمین کے تمام انسان میرے بھائی اور بہن ہیں۔ میں کسی انسان کو حقیر نہیں سمجھتا۔ اسے راہ ہدایت پر لانے کی کوشش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ روشن راستے کو دیکھ لے، پوری کائنات سے مجھے محبت ہے۔ کیونکہ اس سے میرا تعلق ہے، میرے اردگرد چاروں طرف جو پڑوسی آباد ہیں مجھے ان سے محبت ہے اور چاہے درخت ہو یا پتھر، گھاس پھوس ہو یا حیوانات، پہاڑ ہو یا ندی مجھے مٹی بھی بہت پسند ہے کیونکہ اسی سے میرا وجود ہے، اسی میں مجھے ملنا ہے اور اسی سے مجھے اٹھایا جانا ہے۔ سکون واطمینان میری غرض ہے۔ میں کون ہوں؟ میں ایک مومن ہوں اسی لیے میں بھلائی نیک اور حق کو پسند کرتا ہوں یہی میری تمنا ہے اور یہی میری شناخت ہے۔ اپنی بات کہہ کر ننھے میاں جیسے ہی خاموش ہوئے۔ چھوئی موئی کا پودا دکھی لہجے میں بولا، سراسر جھوٹ۔۔۔! میں سمجھتا ہوں تمھیں تو یہ کہنا چاہیے کہ تم بہت سنگ دل ہو، صرف اپنے بارے میں سوچتے ہو۔ اگر میری ذرا بھی فکر تمھیں ہوتی تو تم جب مجھے زمین سے اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے آئے تھے سب سے پہلے میری پناہ گاہ ایک گملے کو بناتے اور ایسا کرنے میں تمھیں آسانی نہیں تھی تو آنگن کی کیاری میں ہی لگا دیتے۔ کم سے کم میں یوں فنا تو نہیں ہوتا۔ پر تمھیں صرف اپنی فکر تھی اور انجام آج سامنے ہے تم وہیں رہے پر میں کب کا جا چکا ہوں۔ اب دوبارہ میں زندہ نہ ہو سکوں گا۔ آج میں صرف اور صرف تمھارے لیے ایک یاد ہوں۔ بس جاتے جاتے اتنا کہوں گا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ’تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور اس سے اس کے ماتحتوں سے متعلق سوال ہوگا، پس امیر نگراں ہے اور آدمی اپنے گھر والوں پر نگراں ہے اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اپنے بچوں پر نگراں ہے۔ پس تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔‘ ☐☐☐

Zaibun Nisa Haya

A-1, 4th Floor, M. M. Apartment

Near Shiya Masjid, Okhla Vihar

Jamia Nagar, New Delhi-110025

شمس الہدیٰ انصاری

دیوی

دیوان وشنو سہائے پر فالج کا اثر ہوا تھا۔ وہ بالکل مفلوج ہو کر بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ بہتر سے بہتر علاج کرایا گیا۔ لیکن سب بے کار، دیوان صاحب کا دایاں ہاتھ دایاں پاؤں بالکل بے کار ہو گیا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ ان کی خدمت اور صاف صفائی کی ضرورت تھی۔ کئی نوکر رکھے گئے اور توقع سے زیادہ ان کی تنخواہ مقرر کی گئی تاکہ دیوان صاحب کا خاص خیال رکھیں، لیکن نوکر دس بارہ دن سے زیادہ ٹک نہ سکا اور پھر ساری ذمہ داری لاجونتی پر آگئی اور انھیں تو ہر حال میں سب کچھ برداشت کرنا ہی تھا۔ دھرم پتنی جو ٹھہری!

لیکن شوہر کی تیمارداری کرتے کرتے وہ بھی بیمار پڑ گئی۔ یہ تو شکر ہے کہ دیوان صاحب کا کاروبار کافی پھیلا ہوا تھا اور دونوں جوان لڑکے پوری لگن کے ساتھ دیوان صاحب کے کاروبار کو سنبھال چکے تھے۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ روزانہ سینکڑوں روپے دیوان صاحب کے علاج پر خرچ ہو رہے تھے۔ باجود اس کے اب لاجونتی کے اندر آہستہ آہستہ جھنجلاہٹ سی پیدا ہونے لگی تھی اور خاص طور پر سوتے سوتے اچانک جب اسے اٹھ کر بستر وغیرہ صاف کرنا پڑتا تو اس کے چہرے پر کبیدگی کے آثار صاف نمایاں ہو جاتے۔ ہر دن جب دونوں لڑکے دو مختلف دکان کھولنے گھر سے باہر نکلنے لگتے تو ماں ان دونوں کو تائید کرتی کہ کسی نہ کسی ملازم کا بندوبست کیا جائے، جو دیوان صاحب کی خدمت اور دیکھ بھال کر سکے۔ دونوں لڑکے سعادت مندی سے ہاں ہاں کہتے ہوئے گھر سے دکان کی جانب نکل پڑتے۔ لاجونتی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی، کبھی ان کے چہرے پر وقار برستا تھا۔ لیکن اب تو چہرے پر مردنی اور یاسیت کے آثار صاف نمایاں تھے۔ دونوں بیٹوں کی نظر سے ماں کا کرب پوشیدہ نہ تھا لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ گذشتہ ایک برس کے دوران کم از کم بیس نوکر بھاگ چکے تھے۔ یوں بھی اس شہر میں گھریلو کام کاج کے لیے آدمی کا ملنا مشکل تھا۔ کیونکہ دن بھر میں ایک دو بار کوئلہ بیچ کر دونوں کی کمائی ہو جاتی ہے اور آدمی (ملازم) بھی کیسا، جو بھروسے مند ہو اور جس کی نگرانی میں دیوان صاحب کو چھوڑ کر لاجونتی آرام سے سو سکے لیکن ایسا آدمی تو واقعی نایاب تھا۔ مجبوری کے باعث کئی نوکر کام کے لیے آئے لیکن دو تین دنوں کے بعد ہی ان کے چہروں سے گھن اور اکتاہٹ کی جھلکیاں صاف دکھائی پڑتیں اور جیسے تیسے اپنا حساب کر کے چلتے بنتے۔

ایک دن چھوٹے بیٹے دیوان اجے سہائے نے ماں سے کہا، ماں آدمی (ملازم) تو دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن ایک عورت اس کام کے لیے تیار ہوگئی ہے۔ بے چاری غریب ہے شوہر شرابی ہے، روزانہ مار پیٹ کرتا ہے اور کھانے کو بھی نہیں دیتا ہے۔ میں نے پتا جی کے لیے دیکھ بھال اور تمام صفائی کرنے کی بات کی تو وہ راضی ہوگئی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ یہ کام چھوڑ کر نہیں بھاگے گی۔ لاجونتی کچھ سوچ میں پڑ گئی، پھر ماں نے پوچھا کیا عمر ہوگی اس کی اور کیا اس کا بچہ وغیرہ بھی ہے؟ اجے نے اندازہ لگا کر کہا عمر یہی چالیس کے قریب ہوگی اور ہاں دو سال کا بچہ بھی ہے۔ رات کو وہ چلی جائے گی، دن کے وقت بچہ اس کے ساتھ رہے گا۔

لاجونتی سوچ میں پڑ گئی، پھر اس نے کہا، اگر وہ رات کو چلی جائے گی اور رات کے وقت بستر وغیرہ صاف کرنے کی ضرورت پڑی تو پھر مجھے ہی اٹھنا پڑے گا پھر مجھے آرام کہاں ملے گا؟ ماں وہ رات کو بھی یہاں رہنے کو راضی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اس طرح شرابی شوہر سے نجات مل جائے گی۔

ماں میں نے سب سوچ لیا ہے۔ اگر اس کا شوہر پریشان کرے گا تو پولس میں صرف ایک ڈائری دینے کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ ڈائری خود وہ عورت شیلا ہی دے گی اور پھر اس کا شوہر ہمارے گھر کے آس پاس بھی نہیں بھٹکے گا۔ لیکن بیٹے یہ تو سوچو کہ وہ ایک غیر عورت ہے اور ایک غیر عورت کسی دوسرے مریض مرد کو ہاتھ لگانا اس کی گندگی وغیرہ کو صاف کرنا منظور کرے گی؟ ماں میں نے یہ سب باتیں بھی طے کرلیں ہیں اور اسے سب منظور ہے۔ وہ بڑی سمجھدار ہے، اس کا کہنا ہے کہ اسپتال میں بھی تو نرس غیر مردوں کے جسم کو چھوتی ہے۔ اس کی خدمت کرتی ہے۔ پھر ماں وہ پتا جی کو ایک مریض سمجھ کر دیکھ بھال کرے گی۔

لاجونتی خاموش ہوگئی اور کہتی بھی کیا۔ حالانکہ اسے یہ سب پسند نہیں آیا کہ ایک غیر عورت اس کے شوہر کی تیمارداری کرے اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کے جسم کو ہاتھ لگائے لیکن یہاں لاجونتی کے آرام کا سوال تھا اور انھیں بھی آرام چاہیے تھا۔ پھر بادل نخواستہ اس نے اپنے بیٹے کی تجویز مان لی۔ لیکن چہرے پر تفکرات کے آثار مٹ نہیں پائے تھے اور کچھ سوچ کر

آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی اور اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگی اسے آئینے میں ایک ادھیڑ عمر عورت نظر آئی۔ جو اس کے خیال میں کوئی اور عورت تھی......وہ تو ہرگز نہ تھی...... اس نے تنقیدی نظروں سے اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ لیکن یہ جائزہ بھی اسے پسند نہ آیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد کچھ سوچ کر الماری سے اپنی وہی بنارسی ساڑی نکالی جو اس کے پتی نے شادی کی رات کو اسے تحفے میں دی تھی۔ جو بے حد خوبصورت اور قیمتی ساڑی تھی۔ اس نے نہادھو کر وہ ساڑی پہن لی اور خوب چاؤ کے ساتھ بناؤ سنگھار کیا اور دوبارہ اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگی اس مرتبہ وہ پہلے سے قدرے بہتر نظر آئی...... اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اطمینان اس بات پر ہوا کہ نئی ملازمہ شیلا میرے شوہر کو زیر نہ کر سکے گی اور پھر بالکونی سے اتر کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

خانساماں، ڈرائیور، دیگر ملازمین نے لاجونتی کو حیرت سے دیکھا اور آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کیے، ان کی یہ حرکت لاجونتی نے محسوس کر لی۔ اور غضب ناک نگاہوں سے انھیں گھورا، تو وہ سبھی اپنے اپنے کام میں مشغول ہوگئے۔

نئی ملازمہ لگ بھگ چالیس سال کی چھریرے بدن والی عورت تھی۔ جس کے بدن کا ہر حصہ سازندوں کے ساز کی مانند کسا ہوا تھا۔

اس کی گود میں دو سال کا بچہ تھا۔ لاجونتی نے خاموشی کے ساتھ اس کا جائزہ لیا۔ اور اس کے سراپے پر غور کیا تو اس کی نظریں جھک گئیں! وہ اپنی مفلسی اور تباہ حالی کے باوجود دلکش لگ رہی تھی۔ اگر اسے اچھا لباس پہنا دیا جاتا تو وہ ایک خوبصورت اور دلکش جاذب نظر عورت ثابت ہوتی۔

لاجونتی خشمگیں نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہی وہ سادگی اور معصومیت کی عورت بنی اس کے سامنے امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لاجونتی نے گہری سانس لے کر پوچھا میرے بیٹے نے سب کچھ بتا دیا ہوگا کہ تمھیں کیا کیا کرنا ہے۔ جی بی جی! بابو صاحب نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ دیکھو تمھیں رات کو بھی یہاں رہنا ہے۔ کھانا کپڑا وغیرہ ہم سب کچھ تمھیں دیں گے اور ماہانہ پانچ سو روپیہ بھی بولو منظور ہے؟ جی منظور ہے بی بی جی آپ نے تو امید سے زیادہ کہہ دیا۔ میں نے تو صرف اپنے اور اپنے بچے کی پرورش کی تمنا کی تھی۔ خیر تمھیں ہماری پیشکش اچھی لگی، ایمانداری اور محنت سے کام کرو گی تو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ دوں گی، لیکن ہاں تمھارا پتی تو آکر پریشان نہیں کرے گا؟ بی بی جی اسے پیسے کی ضرورت ہے، شرابی ہے۔ آپ پیسے دیں گی وہ پیسے میں اپنے پتی کو دوں گی تو وہ مجھے کیوں پریشان کرے گا؟

بی بی جی وہ شرابی کبابی بے کار آدمی ہے۔ کام کاج کچھ نہیں کرتا۔ شرابی بے کار آدمی اور کیا کرے گا سوائے بیوی کو مارنے پیٹنے کے! اس کے باوجود ایسے خراب آدمی کو تم پیسے دو گی، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

بی بی جی آخر وہ میرا پتی ہے میرے بچے کا باپ ہے۔ اگر میں نے اپنی کمائی کے پیسے اسے نہیں دیے اور پھر اس نے کسی پرائی عورت سے ناطہ جوڑ لیا تو پھر میرا کیا ہوگا؟ بی بی جی آخر کو وہ میرا آدمی ہے اور میں یہ کیسے برداشت کروں گی کہ وہ کسی پرائی عورت کے ساتھ سوئے اور لاجونتی سوچتی رہ گئی کہ آخر یہ کیسا رشتہ ہے۔ وہ عورت اور مرد کے درمیان اس رشتے کی گہرائی و گیرائی تک پہنچ نہ سکی اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا تا کہ وہ اپنا کام سمجھ لے۔ اس کے جانے کے بعد وہ گھنٹوں اس عورت کے بارے میں سوچتی رہی۔

اس عورت کے آجانے کے بعد لاجونتی کو صحیح معنوں میں آرام ملا۔ اس نے توقع سے بڑھ کر اپنے فرض کو سمجھا تھا اور وہ ہر کام پوری ذمہ داری سے نبھاتی رہی۔ اس کی خدمات اور تیمارداری کے آثار نمایاں ہونے لگے اور ایک دن دیوان صاحب کو سہارا دے کر آنگن میں بیٹھا دیا اور انھیں گرم پانی سے نہلایا اور جسم کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ دیوان صاحب کے اندر جینے کی نئی رمق جاگ اٹھی۔ چند ماہ اسی طرح گزر گئے اور اب تو دیوان صاحب کے چہرے پر سرخی کی رونق نظر آنے لگی۔ یہ عورت اپنے آپ کو دیوان صاحب کے لیے وقف کر چکی تھی۔ کبھی وہ ان کے جسم کی مالش مساج کرتی کبھی گرم تیل سے سوجے ہوئے ہاتھ پاؤں کو رگڑتی۔ پھر رفتہ رفتہ دیوان صاحب اس کے سہارے چلنے پھرنے لگے۔

دیوان صاحب روبہ صحت تھے لاجونتی ان کے لیے چائے لے کر جاتی تو دیوان صاحب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے اور خاموش آنکھوں سے پوچھتے کہ وہ کہاں ہے؟ رفتہ رفتہ لاجونتی کو اس عورت سے چڑ ہونے لگی اور وہ اپنے آرام بستر پر بیٹھی سب کچھ دیکھتی رہتی۔ اس عورت کا بچہ زمین پر آرام سے کھیلتا رہتا اور ملازمہ خود بستر پر بیٹھ کر ان کی پیٹھ اور کمر پر تیل کی مالش کرتی۔ کبھی کبھی انھیں کپڑے پہننے میں بھی ان کی مدد کرتی اور ایسے موقع پر دیوان صاحب کے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے گرد حائل رہتے۔ دیوان صاحب کے جسم میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا۔ لیکن اس عورت (ملازمہ) کے چہرے پر کوئی خاص جذبے کا اظہار نہیں ہوتا اور ہوتا بھی کیوں؟ وہ تو ایک آیا تھی جو خدمت کے لیے رکھی گئی تھی۔ لاجونتی کبھی کبھی خاص طور سے اس عورت کے چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی، لیکن کسی بھی جذبے سے عاری اس کا چہرہ ہوتا تھا۔ اس کے برعکس دیوان صاحب

کے چہرے اور آنکھوں میں ایک قسم کی چمک ضرور نظر آتی۔ دیوان صاحب کو عورت کی قربت حاصل کرنے کی امنگ جاگنے لگی۔ دوسرے دن لاجونتی نے خود باورچی خانے میں جا کر اپنے شوہر دیوان صاحب کے لیے انڈوں کا آملیٹ بنایا اور بڑے پیار سے لے کر ان کے پاس گئی۔

دیوان صاحب نے ایک نظر انڈوں کے آملیٹ پر ڈالی اور بے نیازی سے اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ لاجونتی نے بڑے پیار سے کہا۔ میں تمھارے لیے اتنے پیار سے آملیٹ بنا کر لائی ہوں اور تم ہو کہ میری طرف دیکھنا تک گوارہ نہیں کر رہے ہو۔ دیوان صاحب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا اس ٹیبل پر رکھ دو اور اس عورت سے کہہ دو وہ آ کر کھلا دے گی۔ لاجونتی کے جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی، تلخ لہجے میں بولی۔ کیوں اب صرف وہی عورت رہ گئی ہے اور میں کچھ بھی نہیں؟ دیوان صاحب خاموش رہے اور بدستور اخبار پڑھتے رہے۔ آخر بولتے کیوں نہیں؟ آپ مجھ سے خفا کیوں ہیں؟ دیوان صاحب نے اخبار ٹیبل پر رکھ دیا اور بولے میں کسی سے کیوں خفا ہونے لگا اور پھر اس عورت سے تم کیوں جلتی ہو اسے تو تم نے ہی اپنے آرام کے لیے رکھا ہے۔ آخری جملہ انھوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ میں نے اسے رکھا ضرور ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہر معاملے میں دخیل ہو۔ اس کی حیثیت ایک نوکرانی کی ہے اور میں تمھاری پتنی ہوں۔ دھرم پتنی...... لاجونتی کا لہجہ طنز سے بھرپور تھا۔ دیوان صاحب بولے لاجونتی تم میری صرف بیوی ہو سکتی ہو صرف بیوی، اپنے آپ کو دھرم پتنی کبھی نہ کہنا۔ کیوں آخر ان دو لفظوں میں کیا انتر ہے۔ انتر ہے لاجونتی، مجھے ایسی حالت میں تم نے جس طرح دوسری عورت کے حوالے کیا، ایسا کوئی بھی نہیں کرتا۔ اس عورت نے میرے لیے جو کچھ بھی کیا وہ یقیناً صرف پیسوں کے لیے کیا یہ میں مانتا ہوں، لیکن پیسے لے کر اس نے جس طرح اپنا فرض نبھایا اور مجھے ایک نئی زندگی کی طرف گامزن کیا، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ لاجونتی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے اور دل ہی دل میں اس نے کوئی فیصلہ کیا اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ٹھیک ہے میں اگلے ماہ اس عورت کو ہٹا دیتی ہوں اور آپ کی پوری دیکھ بھال اب میں خود کروں گی۔ کتنے دنوں تک؟ دیوان صاحب کا لہجہ پھر طنز سے بھرپور تھا۔ جب تک جان میں جان ہے۔ لاجونتی کا لہجہ بھی مستحکم تھا۔

ٹھیک ہے ہٹانا چاہو تو ہٹا لو لیکن اس سے پہلے فون پر میرے وکیل سے بھی بات کر لینا۔ میں نے اپنی وصیت میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ لاجونتی سناٹے کے عالم میں اپنے شوہر کو دیکھتی رہی۔ دیوان صاحب بولے بھاگیہ وان وہ عورت ایک 'دیوی' ہے 'دیوی'! قسمت کی خرابی سے اسے ایک خراب شوہر ملا، لیکن شکر ہے بھگوان کا اسے مجھ تک لے آیا۔ میں آج نہیں تو کل مر جاؤں گا، پھر اس بے چاری کا کیا ہوگا۔ لہٰذا میں نے وکیل کو بلا کر وصیت میں ترمیم کر دی ہے۔ کیا میں جان سکتی ہوں کہ وہ ترمیم کیا ہے؟ ضرور یہ تو تمھارا حق ہے میں نے اپنی WILL میں صرف اتنا لکھوایا ہے کہ میرے جیتے جی اور مرنے کے بعد بھی اس ملازمہ شیلا کو تا زندگی 1 ہزار روپے ماہوار دیے جائیں۔ یہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں ہے لاجونتی، میں نے اس نیک کام سے اپنا سورگ سنوار لیا۔ اب کہو تم کیا کہتی ہو؟ لاجونتی الجھن میں مبتلا ذہنی طور پر ماؤف ہوتے ہوئے، قدرے سنبھل گئی ایک ہزار کی رقم سن کر لاجونتی کے چہرے پر رونق آ گئی اور اس نے بڑے خلوص سے کہا، جی مجھے کوئی اعتراض نہیں! درمیان میں لاجونتی بول پڑی سنو شیلا تمھیں یہاں سے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیوان صاحب ہنس پڑے اور کہا کہ تم عورتوں کا دماغ ہوتا ہی نہیں! ویسے میں نے جب جب محسوس کیا کہ تم پردے کی آڑ میں ہمیں دیکھ رہی ہو، تب تب میں اسے ضرورت سے کچھ زیادہ قریب کر لیا کرتا تھا، تاکہ تمھیں اپنے قریب بلا سکوں اور تم سمجھ سکو کہ تمھاری ہمیں کتنی ضرورت ہے۔ نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی طور پر تم میرے ساتھ ساتھ رہو! لاجونتی حیرانی سے دیوان صاحب کو دیکھتی رہی۔ دیوان صاحب نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا، لاجونتی دیکھو دھرم پتنی زندگی بھر کا سہارا ہوتی ہے۔

پتی اور پتنی زندگی کیا! جنم جنم کے ساتھی ہوتے ہیں، لیکن جب تم مجھ سے دور ہوتی چلی گئی تو تمھیں دوبارہ اپنے پاس بلانے کا اس کے سوا اور کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا اور یہ عورت (ملازمہ) اس کو سب کچھ معلوم تھا؟ ہاں بھاگیہ وان اسے میں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ ایک دیوی ہے لاجونتی نے جھینپ میں آ کر پیچھے منہ گھما کر دیکھا تو سامنے وہ عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لاجونتی کو دیکھتے ہی اس نے کہا جی بی بی جی آپ ہٹ جائیے دیوان صاحب کو نہلانا ہے۔ چل بھاگ یہاں سے جا کر باورچی خانے کا کام دیکھ آج سے دیوان صاحب کو میں نہلاؤں گی، لاجونتی نے خوشی سے کہا۔ ملازمہ شیلا ادائے بے نیازی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور اس کا دو سالہ بچہ منہ اٹھائے حیرت سے لاجونتی کی طرف دیکھ رہا تھا!!!

□□□

Shamsul Hoda Ansari
Nishat Nagar, Wasseypur
Dhanbad-826001 (Jharkhand)

سفینہ بیگم

بلاعنوان

میں بہت دیر سے قلم کو ہاتھ میں تھامے اسی سوچ میں ہوں کہ کیا لکھوں ۔آج بہت دن بعد میری ملاقات میری ڈائری سے ہوئی ہے۔میری پیاری ڈائری جس سے خالی وقت میں میں رازو نیاز کرتا ہوں اور جب دل بھر جاتا ہے تو میز کے سب سے نیچے والے خانے میں اسے رکھ کرتالا لگا دیتا ہوں اور جیسے دل کو قرار آجاتا ہے کہ میرے رازوں میں صرف میری ڈائری ہی شریک ہے۔اس کے خالی پنے بار بار مجھے لکھنے پر اکسا رہے ہیں ۔اپنی طرف کھینچ رہے ہیں ۔قلم کی نوک اپنے سائے سے گلے ملنے کے لیے بیتاب ہے میں بار بار اسے نیچے کی جانب لے جاتا ہوں اور پھر اوپر اٹھا دیتا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہا ہے۔کیا زندگی کے اس لمحے کو گرفت میں لوں جب میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔جیسے برسات کی تیز دھوپ میں وہ بارش کی مانند چھم سے میرے دل کے آنگن میں اتری تھی اور میرے پورے وجود کو سیراب کر گئی تھی یا وہ لمحہ لکھوں جب میرے ابا مجھے چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے تھے ۔نہیں، محبت تو آج کل ہر دوسرے شخص کو ہو جاتی ہے اور مرنا بھی ہر ایک کو ہے۔میں کوئی ادیب تو نہیں ہوں ۔ادیب ،مصنف ،رائٹر۔۔ہاں ہاں یہی تو لفظ ہے جس سے مجھے سخت نفرت ہے اسی ایک لفظ نے تو میری زندگی بدل دی۔

''اصغر بیٹا ذرا یہاں تو آنا''۔

''جی امی بس آیا''

''بیٹا مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔۔دیکھو تمھارے ابا کی خواہش تھی کہ تم ایم۔اے کرو لیکن پتہ نہیں تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ پڑھائی سے جی چرانے لگے ہو۔دکان تو فراز دیکھتا ہے نا تو تم کیوں اس کے ساتھ دکان چلے جاتے ہو۔ایم۔اے کرو کچھ بن کر دکھاؤ۔کیا ہوا تم ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔''

''ارے یہاں آ میرا بچہ ذرا اپنی دادی کی ٹانگیں تو دبا دے۔ان پنڈلیوں میں تو درد ہی ختم نہیں ہوتا۔سیکڑوں دوائیں کر لیں۔تو پڑھ لکھ جا تو میرا علاج تو ہی کریو۔''

''ارے ارے یہ لڑکا تو ان سنا کر گیا۔ارے......

اب میں دادی اور امی کو کیا بتاؤں کہ میں ایم۔اے میں داخلہ کیوں نہیں لے رہا ہوں یا میں پڑھ لکھ کر کیا کروں گا۔میرا دل بالکل ویران ہے جیسے یہ سڑک سنسان اور خاموش ہے لیکن اس خاموشی میں بھی لگتا ہے یہ کسی سے باتیں کرنا چاہتی ہو اپنے راز کہنا چاہتی ہو۔ایسے راز جو صرف اسے ہی معلوم ہوں اور کسی کے راز سننا چاہتی ہو کسی کے دکھ بانٹنا چاہتی ہو۔

بی۔اے کی کلاس میں اس کا پہلا دن تھا۔لکھنا اس کو بچپن سے ہی بہت پسند تھا۔وہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا کبھی اماں کے بارے میں کبھی ابا کے،کبھی نانا جان کو خط تو کبھی بڑے بھائی پر لطیفہ ہی بنا ڈالتا۔کالج کے داخلہ میں اس کا نمبر سب سے پہلا تھا وہ بہت خوش تھا۔ابا نے اس کو کورس کی ساری کتابیں خرید دی تھیں اور وہ کلاس میں محنت اور لگن سے پڑھتا۔استاد کی ہدایت پر نوٹس بھی لیتا رہتا اور لائبریری کی مدد سے مختلف کتابوں کو بھی کھنگالتا رہتا تھا۔کلاس کے سارے بچے اس کو پڑھاکو کہہ کر پکارتے تو اسے غصہ آنے کے بجائے اچھا لگتا اور وہ مسکرا کر سب کا جواب دیتا۔لیکن کچھ دن سے وہ الجھن کا شکار تھا۔لائبریری میں گھنٹوں گزار کر آتا لیکن کچھ لکھ نہیں پاتا۔

''کیا بات ہے اصغر تم اتنے اداس اور پریشان کیوں بیٹھے ہو۔''
''کچھ نہیں بس ایسے ہی۔۔''
''کوئی تو بات ہے بتاؤ۔''
''ارے میں بہت دن سے کچھ اچھا لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کوئی مضمون، لیکن لگتا ہے میں لکھ نہیں پاؤں گا۔''
''تم تو پڑھائی میں کتنے اچھے ہو۔شیراز سر تمھاری کتنی تعریف کرتے ہیں۔تم ان سے مدد کیوں نہیں لیتے۔''
''میں گیا تھا ان کے پاس۔انھوں نے کہا پہلے کچھ لکھ کر دکھاؤ۔''
''ہاں تو یہ اچھی بات ہے۔پھر کیا پریشانی ہے۔''
''اصل میں میں ایک مضمون کسی رسالے میں شائع کروانے کے لیے لکھنا چاہ رہا ہوں۔جو کہ میرا پہلا مضمون ہوگا۔۔اچھا چلو میں کوشش کرتا ہوں۔''
اصغر تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔سوئے کیوں نہیں اور یہ کیا کھڑکی کے پاس کھڑے خالی سڑک کو تکے جا رہے ہو۔کیا بات ہے تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔
''جی میں بس سونے ہی جا رہا تھا۔''
''تمھارا چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے۔''
''نہیں تو۔۔میں ٹھیک ہوں امی۔۔
''چلو لیٹ جاؤ۔میں لائٹ بند کر دیتی ہوں اور جو میں نے پوچھا ہے اس کے بارے میں مجھے صبح بتانا۔۔۔اور ہاں کل دکان پر جانے کی ضرورت نہیں ہے خدا حافظ۔۔
کاش امی آپ صبح تک یہ بات بھول جائیں۔مجھ سے پڑھائی کے متعلق کچھ نہ پوچھیں۔آپ کو کیا معلوم۔۔۔
وہ بی۔اے کا دوسرا سال تھا۔اس نے اپنی تحریر میں پختگی لانے کے لیے بہت کچھ پڑھا، بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔وہ جب استاد شیراز کے پاس کچھ بھی لکھ کر لے جاتا وہ اس میں اصلاح کی غرض سے جگہ جگہ لال قلم چلا دیتے اور اسے مزید بہتر کرنے کا کہہ کر واپس کر دیتے۔وہ جھنجلاتا اور الجھتا نہیں بلکہ خوشی خوشی اس کو دوبارہ صحیح کرنے میں لگ جاتا۔وہ کلاسک کے ساتھ ساتھ جدید متون کا بھی مطالعہ کرتا۔علما اور مفکروں کی شخصیتوں کا مطالعہ کرتا تو اس میں جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا اور وہ پہلے سے زیادہ محنت کرنے میں لگ جاتا۔استاد شیراز اسے ہمیشہ کہتے کہ تم ایک بڑے ادیب بنو گے بس خوب پڑھو لکھو۔

''سن یار میں آج بہت خوش ہوں۔اور مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا ہے کہ میں نے اتنا اچھا مضمون لکھا ہے۔شیراز سر میری بہت تعریف کر رہے تھے۔''
''اچھا اچھا پہلے تو یہاں بیٹھ آرام سے، تیری سانس پھول رہی ہے۔ہاں اب بتا''۔
''وہ کہہ رہے تھے ہمارے کالج کو تمھارے جیسے لکھنے والے بچوں کی ضرورت ہے۔''
''ارے واہ تو بس اب تو جلدی سے اسے کسی رسالے میں بھیج دے تاکہ جلد از جلد شائع ہو جائے۔''
''نہیں ابھی سر نے کہا ہے کہ وہ اس میں کچھ نکتوں کو اضافہ کریں گے تب واپس کریں گے۔''
میں بہت دیر سے سونے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن خیالات ہیں اڈے چلے آتے ہیں اور مولانا صاحب کی چھڑی کی طرح میرے اوپر برسنے لگتے ہیں۔میری پیاری ڈائری میں جو بات تم سے کرنا چاہتا تھا۔وہ تو کر ہی نہیں سکا۔اور تمھیں دیکھ کر لگ رہا ہے جیسے تم بہت کچھ جاننا چاہ رہی ہو تاکہ میرے دکھ سکھ میں شریک ہو سکو،لیکن میں تم سے ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں اپنی ڈائری میں صرف خوشی اور سکون دینے والے لمحات کو قلم بند کرنا چاہتا ہوں تاکہ جب بھی میں اپنے برے وقت میں تمہیں کھولوں تو میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جائے۔میری پیاری ڈائری دکھوں کا بوجھ زندگی کی کمر کو جلدی جھکا دیتا ہے اور یہ بوجھ فیکٹری میں کام کرنے والی حاملہ عورت کے سر پر رکھے اس بوجھ کی مانند ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً بدن میں ٹیس پیدا کرتا ہے۔لیکن میں اس دکھ کی ٹیس محسوس کر کے نہیں بلکہ خوشیوں کے لمحات کو یاد کر کے جینا چاہتا ہوں۔تم سن رہی ہو نا میری بات۔اب میں تمھیں تبھی کھولوں گا جب کوئی حیرت انگیز خوشگوار لمحات میری زندگی میں آئیں گے تو میں وہ قصہ تمھیں ضرور سناؤں گا۔اچھا خدا حافظ
''اصغر او اصغر میری دوا تو لا دے۔۔یہ شبو مراتی کہاں مر گیا۔اس کو بھیجا تھا دوا لینے۔۔ہائے میں مر گئی۔۔ارے تو ہی کوئی دوا لا دے۔کس بات کی پڑھائی پڑھی ہے تو نے۔۔۔لو اسے میں کچھ کہہ دوں تو اسے سانپ سونگھ جاتا ہے۔۔۔
''اصغر تم یہاں چھت پر کیوں چلے آئے۔دادی کی بات کا برا نہ مانا کرو، چلو نیچے۔''
''نہیں امی میں تو پتنگوں کو اڑتا ہوا دیکھ رہا ہوں اور مزہ لے

رہا ہوں۔"

"اچھا۔ پتنگیں اڑ کم رہی ہیں اور کاٹی زیادہ جا رہی ہیں۔ چلو خیر وقت پر اتر آنا۔"

"اصغر کیا ہوا شیراز سر نے تیرا مضمون دیا۔ اب تو دو مہینہ ہو گئے۔"

"ہاں میں بھی پریشان ہوں۔ سمجھ نہیں آ رہا اور ہمت بھی نہیں ہو رہی بار بار پوچھنے کی۔ وہ ہر بار تھوڑے دن کا کہہ کر بھیج دیتے ہیں۔"

"اچھا چل کتابوں کی دکان پر چل کر کوئی اچھی سی کتاب خریدتے ہیں۔"

"چاچا یہ کتاب اٹھائیں۔۔۔ ارے یہ چھوڑو اصغر یہ رسالہ دیکھو بہت اچھا نمبر نکلا ہے اس بار۔۔"

"اچھا لائیں دکھائیں۔"

"اصغر کیا ہوا۔ تمھارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔۔

کیا نہیں ہو سکتا

یہ یہ تو میرے الفاظ ہیں۔ میری تحریر میری۔۔ یہ اس رسالے میں کیسے۔۔ پروفیسر شیراز یزدانی۔۔ نہیں یہ جھوٹ ہے فریب ہے دھوکا ہے۔ میں دوبارہ پڑھتا ہوں۔۔۔ نہیں مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ لیکن۔۔ کیا انھوں نے میرا مضمون۔ کیا تحریر کا بھی استحصال ہو سکتا ہے۔۔ کیا قلم کی بھی بولی لگ سکتی ہے۔۔ کیا لفظوں کی بھی خرید و فروخت ہو سکتی ہے۔ کیا ایک استاد اپنے شاگرد کے ساتھ...... شاید اس دور میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔ کچھ بھی۔۔

اصغر بیٹا نیچے آ جاؤ۔۔ دن ڈھل رہا ہے اندھیرا ہونے والا ہے

□□□

Safina Begum

Javed khan

C/o Abid Hussain Khan

Retd Head Master

Mohalla Sahukara, Tehsil. Bilaspur

District.Rampur-244921 (U.P)

فرہنگ آصفیہ

جواں بخت۔ ف۔ صفت۔ (۱) جوان نصیبے والا۔ کامراں۔ اقبالمند۔ بہرہ مند۔ بختاور۔ خوش نصیب ہما گوان خوش قسمت۔ نیک اختر۔ (۲) تیمور یہ خاندان کے اخیر پنشن خوار بادشاہ کے بد طالع خفتہ بخت ولی عہد کا جو نواب زینت محل کے بطن سے تھا۔ غالب اور ذوق کی اسی کی شادی کے سہرے کی بابت نوک جھونک ہو گئی تھی ۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا (ذوق)
خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا (غالب)

کھٹ شاستر۔ س۔ اسم مذکر۔ چھے درشن یعنی اول نیائے شاستر جس کا مصنف گوتم رشی ہے اور اس نے اس کتاب کو علم منطق میں لکھا ہے۔ دوسرے ویشیشک شاستر جس کا مصنف کنادمنی اس کی اکثر باتیں نیائے شاستر سے ملتی ہوتی ہیں۔ تیسرے میمانسا یعنی ویدانت جس کا مصنف جیمنی رشی ہے اس میں جگ کرنے برت رکھنے تپسیا کرنے دان دینے اور وید وغیرہ پڑھنے سے نجات یعنی مکتی حاصل ہونے کا حال لکھا ہے۔ چوتھے ویدانت جس کا مصنف بیاس دیو ہے اس میں برہم گیان یعنی علم الٰہی کا ذکر ہے۔ پانچویں سانکھ شاستر جس کا مصنف کپل منی ہے اس کا بیان دہریہ فرقہ کے عقاید سے ٹھیک ٹھیک ملتا ہوا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ دنیا کا کوئی خالق نہیں دنیا ہمیشہ سے چلی آتی اور از خود پیدا ہوتی چھٹے پاتنجل جسے پتنجل منی نے تصنیف کر کے اپنے نام پر نام رکھا اور یوگ شاستر کے نام سے بھی مشہور ہوا کیونکہ اس میں جوگ منی سنیاس کا بیان ہے۔ یہ سانکھ شاستر کے مطابق ہے مگر صرف اتنا فرق ہے کہ اس نے خدا تعالیٰ کو خالق مانا ہے۔ مفصل کیفیت آئین اکبری کی تیسری جلد میں موجود ہے۔

کلہ منار۔ ف۔ اسم مذکر۔ مقلوب الاضافت یعنی منار کلہ۔ (بیچ شہر میں جو دشمنوں باغیوں لٹیروں راہزنوں وغیرہ کے سر یعنی کھوپڑیاں ایک دیوار میں چن کر ٹیلہ سا بنا دیتے ہیں اسے کلہ منار کہتے ہیں اسکے بنانے سے عبرت اور رعب مقصود ہوتا ہے اس زمانہ میں اس کا رواج کابل کے سوا دوسری جگہ نہیں پایا جاتا وہاں حال میں بھی کلہ منار بنایا گیا تھا جس کے موافق یہاں لکھا گیا ہے۔ جن لوگوں نے کلہ منار دیکھا نہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ صرف کھوپڑیاں چن کر بنا دیتے ہیں لیکن یہ مشاہدہ کے خلاف ہے ہمارے دو مخلف دوست حال میں کابل سے یہ کیفیت دیکھ کر آئے ہیں)۔

صبا نسیم

چوڑیاں چڑھاتی ہیں

مچھر اور مکھیاں سرمئی غسل خانے کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مدھم بلب چھت سے لٹکا ہے اور اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے پروانے گھوم رہے ہیں۔ وہ روشنی کے نشے میں مست جھوم رہے ہیں۔ وہ بلب کو فانوس تصور کر کے اس کی چکا چوند سے مسرور ہو رہے ہیں۔

کیا یہ پروانے میرے نکاح کی خوشی میں ناچ رہے ہیں؟ آج صرف وہی ناچیں گے کیوں کہ ہمارے گھر میں رقص ممنوع ہے۔

میں نل کو کھولتی ہوں اور پانی کی ایک ایک بوند سے بالٹی دھیرے دھیرے بھرتی ہے۔ ڈونگا لے کر پانی سر پر ڈالتی ہوں۔ اوپر سے پانی آبشار کے جیسے گرتا ہے اور زلفوں سے گزرتے ہوئے جسم پہ ہزار چھوٹی چھوٹی ندیاں بن کر گردن سے ہوتے ہوئے پیروں تک مچلتا چلا جاتا ہے۔

اچانک بجلی کٹ جاتی ہے۔ میری بد قسمتی اور پروانوں کی بھی۔ خوشی کتنی عارضی ہوتی ہے۔ ایک لمحہ اس میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں اور دوسرا لمحہ اس سے خالی ہوتا ہے۔ جتنی جلدی یہ آتی ہے اس سے دوگنا تیزی سے دور چلی جاتی ہے۔

امی نے مجھے کہا تھا کہ کچھ عرصے بعد میں یہ سارے مسائل بھول جاؤں گی اور امریکہ منتقل ہو کر ایک خوشگوار اور بے فکر زندگی جیوں گی۔ ’وہاں سارا دن، پوری رات بجلی رہتی ہے اور گرم گرم پانی بھی ہمیشہ آتا رہتا ہے۔‘

امریکہ...... میں سوچتی ہوں... امریکہ... ایک دور دراز ملک، اجنبی لوگ... ’کیا وہاں لوگ اردو بولتے ہیں؟‘

میں نے امی سے پوچھا تھا۔

’نہیں بیٹی آپ کو انگریزی سیکھنی پڑے گی۔‘

انگریزی...... ’امم۔ ایری۔ کا ااا‘ میں نے خود سے سرگوشی کی۔ لفظ ادا کرتے ہوئے میری زبان لڑکھڑانے لگی اور میرے منھ کا مزا بھی خراب ہو گیا۔

امی نے میرے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ لیے تھے۔ ’تمھاری بہن امریکہ میں رہتی ہے۔ سب ٹھیک ہوگا فکر نہ کرو۔‘

ٹھنڈا پانی بالٹی سے گر کر قدموں سے ٹکراتا ہے۔ میں فوراً اپنے خیالوں سے نکل کر نل کو بند کرتی ہوں۔ کوئی زور سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

’جی؟‘ میں نے پوچھا۔

میری بہن فاطمہ چلاتی ہے: ’نجمہ تم اتنی دیر سے کیا کر رہی ہو؟ برباد کرنے کے لیے فالتو وقت نہیں ہے۔ سب کو نہانا ہے اور تم کو تیار بھی ہونا ہے، تم جلدی سے نکلو!‘۔

’پانچ منٹ‘ میں نے کہا۔

جلدی جلدی اپنے جسم کو رگڑتی ہوں اور پرانی جلد باریک باریک ہو کر پانی کے ساتھ بدن سے بہتی چلی جاتی ہے جس کے ساتھ میرا بچپن، میری معصومیت اور میری ہندوستانیت بھی چلی جاتی ہے۔ زبان میں اچانک کچھ نمکین سا محسوس ہوا۔ جب منھ پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کہ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی کہ میری آنکھوں نے کب اشک باری شروع کر دی۔ آنسو اتنی تیزی سے بہہ رہے ہیں کہ ان کو روکنا بھی ناممکن ہے۔

وقت اتنی جلدی سے کیسے کٹ گیا؟ بس کل ہی تو تھا جب میں امی کی گودی میں بیٹھ کر کہانیاں سنتی تھی اور ابا کے کندھوں پہ چڑھ کر قلفیاں کھاتی تھی۔ وہ وقت کہاں گیا؟ اب شادی ہونے والی ہے اور میری پوری زندگی بدل جائے گی۔ میں اپنے ہندوستان اور اپنے خاندان کو ایک اجنبی ملک اور ایک اجنبی آدمی کے لیے کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ میں شادی کر کے امریکہ جانا چاہتی ہوں یا نہیں، مجھے پڑھائی چھوڑنی ہے یا نہیں۔ ابا نے خود سے ہاں کر کے میری شادی طے کر دی۔ جوانی کی روشنی کے سامنے کالی گھٹا آ گئی اور ہمارے بچپن کی زندہ دلی چھن گئی۔ میں اور وہ

پروانے ایک سے ہیں۔ ہماری قسمت دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔
میں بالوں کو نچوڑتے ہوئے غسل خانے سے نکلی۔ بہن، صحن میں انتظار کر رہی تھی۔ 'کہاں مر گئی تھیں؟ اتنی دیر میں تو ایک ہاتھی نہا لیتا'۔
اپنی بات کر رہی ہو کیا؟' میں نے مذاق میں کہا۔'
'چپ کرو اور ادھر چلی آؤ۔ تمہیں تیار بھی کرنا ہے۔'
کچھ گھنٹے بعد، بہن ایک آئینہ میرے سامنے لے کر آئی۔ عکس میں میں نہیں بلکہ کوئی انجانی عورت ہے جو مجھ کو حیرت اور رشک سے دیکھتی ہے۔ اس کے لمبے گھنگرالے بال لہرا کے پیٹھ پر گرتے ہیں۔ چھوٹی آنکھیں جو گہرے کاجل سے بھری ہوئی ہیں۔ گال گلابی اور ہونٹ سرخ! مسکراہٹ کی کوئی جھلک تک نہیں۔ یہ کون ہے جو مجھے ایسے سنجیدگی سے گھور رہی ہے؟ یہ کون ہے جس کا چہرا چاند کے جیسے چمکتا ہے لیکن جس کی آنکھیں بالکل خالی ہیں؟ یہ میری صورت تو نہیں ہو سکتی میں پھر سے پوچھتی ہوں۔ یہ انجانی عورت کون ہے؟
دلہن کی امی آکر سر پر دوپٹا سجاتی ہے اور ماتھے کو چوم کر کہتی ہے 'بیٹی، خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے'۔
وہ آئینے کو چھوڑ کر امی کے پیچھے جاتی ہے اور میں بھی اس کا تعاقب کرنے لگتی ہوں۔ میں نکاح کی ایک پوشیدہ گواہ بن جاتی ہوں۔ میں ساری رات دلہن ہی کو دیکھتی ہوں۔ نہ ہنستی ہے نہ مسکراتی ہے، بس سر نیچے جھکا کے بیٹھی رہتی ہے۔ لوگ پاس آتے ہیں اور جاتے ہیں، تصویر کھینچتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہلتی۔
شوہر غائب ہے۔ جب نکاح کرنے کا وقت آیا تو فون ملا کے انھوں نے امریکہ سے یہ شادی قبول کر لی اور یہاں دلہن کے ابا نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ دلہن نے قبول کیا یا نہیں، ہمیں کیا پتا؟
میں اس کے پاس جا کے بیٹھتی ہوں۔ وہ فوراً میرا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور خاموشی سے پوچھتی ہے۔ 'تم کہاں مجھے چھوڑ کے چلی گئیں تھیں؟'
میں جواب نہیں دیتی۔ اس کے چھوٹے سے ہاتھ اور باریک سی دلکش انگلیاں اور ہتھیلیاں مہندی کے دلنشیں رنگ سے سجی ہوئی ہیں۔ دلہن ہاتھ واپس کھینچتی ہے۔ 'بتاؤ!'۔
پھر بھی میں کوئی جواب نہیں دیتی۔ اس کی کلائیاں لال اور سنہری کانچ کی چوڑیوں سے بھری ہوئی ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ کیوں ہم عورتوں کو ایک ہی دائرے میں پھنسا دیتے ہیں؟ باپ کے گھر کا دائرہ اور پھر شوہر کے گھر کا۔ پیدائش، پھر شادی، پھر بچے... یہ زندگی کا دائرہ! مجھ سے پہلے میری امی، ان سے پہلے ان کی امی وغیرہ۔ یہ سلسلہ پشت در پشت چل رہا ہے۔
غصے میں، میں دلہن کی کلائی کو پکڑ کر دباتی ہوں چوڑیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میری گودی میں گر جاتی ہیں اور اس کی رگوں سے خون چھلکنے لگا۔
یہ کیا کر دیا تو نے؟' حیرانی سے پوچھا۔'
میں نے کہا: 'دائرہ توڑ دو تم! اس شادی سے انکار کر دو! بھاگ جاؤ!'۔
پاگل ہو گئی ہو تم کیا؟ بھاگ کے کہاں جاؤں گی؟ ایسا خطرناک خیال کہاں سے آیا ہے؟ اب تم نکلو یہاں سے اس سے پہلے کہ کوئی سن لے۔
پہلے چھوڑنے کا الزام لگایا تھا اور اب ہم کو نکال رہی ہو؟ اور یہ میرا خیال نہیں ہے، یہ آپ ہی کا خیال ہے۔
حیرانی سے اوپر دیکھتی ہے اور آنکھ سے آنکھ ملاتی ہے۔ ہمارا بچپن ختم ہو گیا، اس بات کو تسلیم کر لو اور اس بکواس کو بند کر دو۔ خاندان کی عزت رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے اور ہم کو نبھانی ہے۔ والدین کے لیے اور خدا کے لیے۔ ہماری ذاتی خوشی اہم نہیں ہے۔ ذرا سوچو اگر ہم بھاگتے ہیں تو لوگ کیا کہیں گے؟۔
لوگ کیا کہیں گے سن کر بہت چڑھ پیدا ہوئی... عزت وزت کے نام پر ہم عورتوں نے صدیوں سے بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ میں بولنے ہی لگی تھی لیکن اتنے میں دلہن کی بہن فاطمہ آتی ہے اور کہتی ہے: 'ہائے! یہ خون کہاں سے آیا؟ کیا ہو گیا؟'۔
کچھ بھی نہیں، بس تھوڑی سی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، دلہن کہتی ہے، اور خون کو دوپٹے سے صاف کر لیتی ہے۔
بہن اس کو دوسری چوڑیاں پکڑاتی ہے اور وہ پھر سے ایک ایک چوڑی اپنی کلائی میں چڑھاتی ہے۔
فاطمہ کہتی ہے: 'چلو اب جانے کا وقت ہو گیا؟'۔
دلہن جانے کے لیے اٹھتی ہے اور کچھ قدم آگے بڑھتی ہے پھر اچانک پلٹ کر اپنے عکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھتی ہے: 'کیا تم میرے ساتھ چل رہی ہو؟'

□□□

Saba Naseem
538 Gates Avenue Apt. 2B
Brooklyn, NY 11221,USA

حسن سخن

غزلیں

عزیز بانو داراب وفا

کس قدر کم اساس ہیں کچھ لوگ
صرف اپنا قیاس ہیں کچھ لوگ

جن کو دیوار و در بھی ڈھک نہ سکے
اس قدر بے لباس ہیں کچھ لوگ

مطمئن ہیں بہت ہی دنیا سے
پھر بھی کتنے اداس ہیں کچھ لوگ

وہ برے ہوں بھلے ہوں جیسے ہوں
کچھ ہوں، لوگوں کو راس ہیں کچھ لوگ

موسموں کا کوئی اثر ہی نہیں
ان پہ جنگل کی گھاس ہیں کچھ لوگ

تیرگی میں نظر نہیں آتے
سائے کی طرح پاس ہیں کچھ لوگ

نور جہاں ثروت

تمام عمر کا قصہ لکھوں ارادہ تھا
لکھا تو دل کا ورق اپنا پھر بھی سادہ تھا

گماں یقین کی حد تک کبھی نہیں آیا
ہماری فہم کا دامن ہی کچھ زیادہ تھا

مجھ ہی پہ ختم ہوئیں دوست داریاں ساری
کہ میرے درد کا دریا بہت کشادہ تھا

نہ جانے کیسے ہوئی مات بادشاہ کو بھی
ہمارے پاس تو لے دے کہ ایک پیادہ تھا

تمہارے دور سے ثروت نباہ کر نہ سکی
کہ آس پاس روایات کا لبادہ تھا

حسنِ سخن

پروین شاکر

غزل

چراغ راہ بجھا کیا، کہ رہ نما بھی گیا
ہوا کے ساتھ مسافر کا نقش پا بھی گیا

میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آ کے مرے شہر سے چلا بھی گیا

بہت عزیز سہی اس کو میری دل داری
مگر یہ ہے کہ کبھی دل مرا دکھا بھی گیا

اب ان دریچوں پہ گہرے دبیز پردے ہیں
وہ تانک جھانک کا معصوم سلسلہ بھی گیا

سب آئے میری عیادت کو وہ بھی آیا تھا
جو سب گئے تو مرا درد آشنا بھی گیا

یہ غربتیں مری آنکھوں میں کیسی اتری ہیں
کہ خواب بھی مرے رخصت ہیں رتجگا بھی گیا

انجم رہبر

غزل

کچھ دن سے زندگی مجھے پہچانتی نہیں
یوں دیکھتی ہے جیسے مجھے جانتی نہیں

وہ بے وفا جو راہ میں ٹکرا گیا کہیں
کہہ دوں گی میں بھی صاف کہ پہچانتی نہیں

سمجھایا بارہا کہ بچو پیار ویار سے
لیکن کوئی سہیلی کہا مانتی نہیں

میں نے تجھے معاف کیا جا کہیں بھی جا
میں بزدلوں پہ اپنی کماں تانتی نہیں

انجم پہ ہنس رہا ہے تو ہنستا رہے جہاں
میں بے وقوفوں کا برا مانتی نہیں

حسنِ سخن

ڈاکٹر رؤف خیر

بیٹی بچاؤ

بھارت کی بیٹیاں جو ہوس کی شکار ہیں
دن رات جیسے نفس و نفس کی شکار ہیں
کیسے بچیں گی بھوکی نگاہوں سے یہ بھلا
دس سے اگر بچی ہیں تو دس کی شکار ہیں
بھنوروں کی زد میں کلیاں کئی تتلیاں کئی
جو بھولپن میں لمس کی مس کی شکار ہیں
پابندیوں میں گھٹنے لگا لڑکیوں کا دم
دیوار و در میں قید، قفس کی شکار ہیں
افسوس باپ پر بھی بھروسا نہیں رہا
اپنے ہی گھر میں جیسے اُمس کی شکار ہیں
مخلص یہ غیر محرم و محرم نہیں رہے
چچا و ماموں زاد کے مس کی شکار ہیں
چھوٹوں بڑوں کی پڑتی ہے ان پر بری نظر
کم سن یہ کلیاں جیسے مگس کی شکار ہیں
محفوظ اب چمن میں نہ اسکول میں رہیں
کچھ لڑکیاں تو چار برس کی شکار ہیں
جو لُٹ گیا تھا چاہنے والوں کے ہاتھ سے
اس جام اعتماد کے رس کی شکار ہیں
دشتِ ہوس میں چھوڑ کے سب چل دیے انھیں
بے قافلہ ہوئی ہیں، جرس کی شکار ہیں
ہم جنسیت کا روگ یا ہو جنس کا کمال
معصوم جانیں خیر ہوس کی شکار ہیں

Dr. Raoof Khair
9-11-137/1 Moti Mahal
Golconda, Hyderabad-500008
Telangana)

ہاجرہ نور زریاب

غزل

عزمِ محکم ، جہدِ پیہم خوشنما تہذیب سے
آؤ ہم خود کو سنواریں اب نئی ترتیب سے

اپنا مقصد اپنی ملت کی حسیں تعمیر ہے
کچھ تعلق ہم نہیں رکھتے کسی تخریب سے

تم حقیقت کو سمجھ لو اوراُس کو مان لو
فائدہ کچھ بھی نہیں ہوگا تمھیں تکذیب سے

مدّتوں سے عشق کو میں درگزر کرتی رہی
اب غزل کہنے لگی ہوں عشق کی تشبیب سے

میں نے اس کو دامِ الفت میں مقید کر لیا
نازو اندازو ادا سے حسن کی ترغیب سے

راہ کو مدِّ نظر رکھتی رہی چلتی رہی
منزلوں کو پا لیا میں نے اسی ترکیب سے

پھیکے پھیکے تھے نظارے سونی سونی تھی فضا
دلنشیں موسم ہوا زریاب کی تقریب سے

Hajra Noor Zaryab
Ganga Nagar
Near Mordern English school
Akola-444002 (M.S)

لذیذ پکوان

کھجور کا حلوہ

اجزاء: کھجور آدھا کلو، دودھ دو پیالی، سوجی ایک پیالی، چینی ایک پیالی، کھویا ایک پیالی، ڈالڈا ایک پیالی

ترکیب: گٹھلیاں نکال کر کھجور کو دھو لیں اور دس منٹ کے لیے دودھ میں بھگو کر رکھ دیں۔ چینی میں دو پیالی پانی ملا کر ہلکی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ چینی اچھی طرح حل ہو جائے۔ سوجی کو مائیکرو ویو اوون میں ہلکی اسپیڈ پر پانچ سے سات منٹ رکھیں، پھر کڑاہی میں آدھی پیالی ڈالڈا کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ گرم کریں اور اس میں سوجی اور پانی میں حل کی ہوئی چینی ڈال کر ڈھک دیں۔ اسے ہلکی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ چینی کا پانی خشک ہو جائے اور سوجی اچھی طرح گل جائے۔ پھر اس میں دودھ میں بھگوئی ہوئی کھجوریں ڈال دیں اور بھونتے جائیں، کھجوریں دودھ میں اتنی نرم ہو چکی ہوں گی کہ وہ بھوننے میں ہی میش ہو جائیں گی۔ آخر میں کڑاہی کے کناروں سے آدھی پیالی ڈالڈا ڈالتے ہوئے گھی علیحدہ ہونے تک بھونیں۔ ڈش میں نکال کر اوپر سے کھویا چھڑک دیں اور اس غذائیت سے بھرپور حلوے کا لطف اٹھائیں۔

گاجر کا حلوہ

اجزاء: گاجر ایک کلو، سوجی چار کھانے کے چمچ، چینی ایک پیالی، دودھ کا پاؤڈر دو پیالی، چھوٹی الائچی تین سے چار عدد، بادام کی ہوائیاں حسب پسند، پستے کی ہوائیاں حسب پسند، اخروٹ کی گریاں حسب پسند، ڈالڈا آدھی پیالی

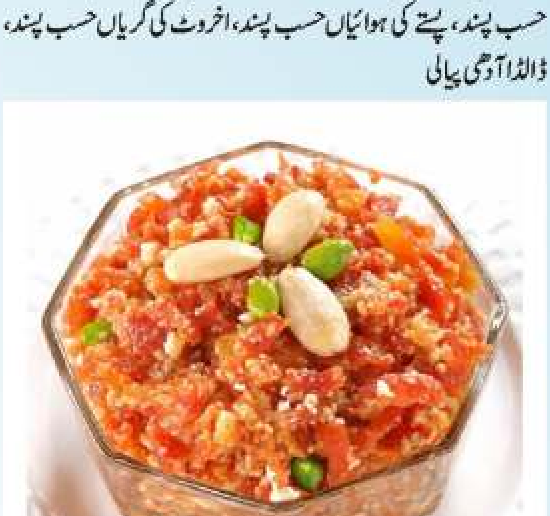

ترکیب: گاجروں کو دھو کر چھیل لیں اور کدوکش کر لیں۔ خالی فرائنگ پین میں کدوکش کی ہوئی گاجروں کو پھیلا کر درمیانی آنچ پر پانچ سے چھ منٹ پکائیں تاکہ بھاپ سے گاجروں کا اپنا پانی اچھی طرح خشک ہو

جائے۔ کڑاہی میں ڈالڈا کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ کے لیے ہلکا سا گرم کریں اور الائچی ڈال کر کڑکڑائیں۔ پھر اس میں سوجی ڈال کر خوشبو آنے تک بھونیں۔ اس میں چینی ڈال کر تین سے چار منٹ تک چمچ چلائیں۔ جب چینی پگھلنا شروع ہو جائے تو گاجر ڈال کر چینی کا پانی خشک ہونے تک بھونیں، دودھ کا پاؤڈر تھوڑا تھوڑا کر کے ڈالیں اور ذرا سی آنچ تیز کر کے اتنی دیر بھونیں کہ گھی علیحدہ ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں۔ گرم گرم ڈش میں نکال کر بادام، پستے اور اخروٹ سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔ مزہ دوبالا کرنے کے لیے آدھی پیالی کھویا ڈال کر پیش کریں۔

من پسند حلوہ

اجزاء: ماش کی دال دو پیالی، کھویا آدھا کلو، چینی دو پیالی، دودھ دو پیالی، چھوٹی الائچی تین سے چار عدد، جائفل پسا ہوا آدھا چائے کا چمچ، بادام پستے کٹے ہوئے آدھی پیالی، ڈالڈا ایک پیالی

ترکیب: دال کو صاف کر کے دھو لیں اور دو سے تین پیالی گرم پانی میں ایک گھنٹہ بھگو کر رکھ دیں۔ پھر پانی اچھی طرح نتھار کر اس میں جائفل ڈال کر چوپر میں پیس لیں۔ دودھ کو ابالنے رکھنے اور ابال آنے پر اس میں چینی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں اور اتنی دیر پکائیں کہ دودھ کی مقدار ایک چوتھائی رہ جائے۔ دودھ کو چولہے سے اتار کر اس میں کھویا ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ بھاری پیندے کی کڑاہی میں ڈالڈا ڈال کر درمیانی آنچ پر گرم رکھیں، اس میں الائچی اور بادام پستے ڈال کر کڑکڑا لیں۔ اس میں پسی ہوئی دال ڈال کر درمیانی آنچ پر اتنی دیر بھونیں کہ اس کی رنگت سنہری ہو جائے۔ اس میں کھوئے کا مکسچر ڈال کر تھوڑی سی آنچ تیز کر کے بھونیں، جب رنگ گولڈن براؤن ہونے لگے تو آنچ ہلکی کر کے توے پر رکھ دیں۔ گھی علیحدہ ہونے پر چولہے سے اتار لیں اور ٹرے میں پھیلا کر ڈال دیں۔ دس سے پندرہ منٹ بعد جب ٹھنڈا ہونے لگے تو قتلیاں کاٹ لیں۔ باریک کٹے ہوئے بادام پستے چھڑک کر اس مرتبہ شب برأت کے موقع پر اس منفرد حلوے کا لطف اٹھائیں۔

پنجابی راجما

اجزاء: لال لوبیا ڈیڑھ پیالی، نمک حسب ذائقہ، ادرک ایک ٹکڑا، لہسن تین سے چار جوے، پیاز دو سے تین عدد، ہلدی ایک چمچ، لال مرچ پسی ہوئی ایک چمچ، سفید زیرہ ایک چمچ، ٹماٹر دو عدد، دہی آدھی پیالی، ثابت گرم مصالحہ ایک کھانے کا چمچ، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، تیل آدھی پیالی

ترکیب: لوبیا کو دو سے تین پیالی گرم پانی میں بھگو کر چار سے چھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں، پھر درمیانی آنچ پر اتنی دیر ابالیں کہ مکمل طور پر گل جائے۔ ایک پیاز کو باریک کاٹ لیں اور ایک پیاز کو ادرک اور لہسن کے ساتھ ملا کر پیس لیں، سفید زیرہ بھون کر کوٹ لیں۔ پین میں تیل ڈال کر اس میں گرم مصالحہ کڑکڑا لیں اور اس میں کٹی ہوئی پیاز کو سنہری فرائی کر لیں۔ پھر اس میں پسی ہوئی پیاز کا مکسچر ڈال کر چار سے پانچ منٹ فرائی کریں اور اس میں کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال کر اتنی دیر بھونیں کہ ٹماٹر اچھی طرح گل جائے۔ اس میں دہی، لال مرچ، زیرہ، ہلدی اور نمک ڈال کر تیل علیحدہ ہونے تک بھونیں۔ ابلی ہوئی لوبیا ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور آدھی پیالی پانی ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکال کر باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا اور ہری مرچیں چھڑک کر گرم گرم چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

(بحوالہ: ڈالڈا کا دستر خوان)

ڈاکٹر احسان رؤف

حمل کے زمانہ میں قبض: اسباب اور علاج

حمل کے دوران حاملہ میں تشریحی (Anatomical)، منافع الاعضائی (Physiological) اور حیاتی کیمیائی (Biochemical) تبدیلیاں ہوتی ہیں، یہ تبدیلیاں صرف جنسی اعضا تک محدود نہیں ہوتی ہیں بلکہ حمل کے دوران ہونے والی تبدیلیاں جسم کے دوسرے نظام میں بھی ہوتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کی اہم وجہ جنین کے نشوونما ہونے سے ہوتی ہیں۔

نظام ہضم میں حمل کے دوران ہونے والی تبدیلیوں میں Gastro intestinal tract کی حرکت کم ہوجاتی جس کی اہم وجہ Progesterone ہارمون کی زیادتی ہوتی ہے۔ معدہ کا Cardiac sphincter کے relax ہونے کی وجہ سے معدہ سے غذائی اجزا کھانے کی نلی میں آنے لگتے ہیں جس کے نتیجہ میں Chemical esophagitis اور سینہ میں جلن کی شکایت ہوجاتی ہے۔ اسی طرح سے آنتوں کی حرکت دودیہ (Peristaltic Movement) کم ہونے کی وجہ سے حاملہ میں قبض کی شکایت ہوجاتی ہے۔

قبض حمل کے زمانہ کی ایک تکلیف دہ بیماری ہے، قبض کے نتیجہ میں ریاحیں زیادہ بنتی ہیں اور جیسے جیسے بچہ کا وزن بڑھتا جاتا ہے اور پیٹ بڑی آنت کے نچلے حصے پر دباؤ بڑھتا ہے اس حالت میں قبض رہنے سے تکلیفیں اور زیادہ ہوجاتی ہیں۔ آج کل کی خواتین حمل کے زمانہ میں آرام زیادہ کرتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بھی یہ صورتحال اور پیچیدہ ہوجاتی ہے۔ دیکھا گیا ہے 60 سے 70 فیصد خواتین میں قبض کی شکایت عام طور سے رہتی ہے، ورزش کی کمی، ریشے دار (فائبرس) غذاؤں کے کم استعمال اور بعض عورتوں میں آئرن کی گولیاں یا کیپسول کھانے سے بھی قبض ہوجاتا ہے۔

جدید تحقیق کے مطابق دوران حمل ہارمون پروجیسٹران کی مقدار بڑھ جاتی ہے، جس کی وجہ سے آنتوں اور معدہ کی حرکت سست ہوجاتی ہے اور روزانہ اجابت نہیں ہوتی۔ بہت سی عورتیں حمل کے زمانہ میں پانی کم پیتیں ہیں اس کی وجہ سے جسم میں پانی کی کمی ہوجاتی ہے اور پاخانہ سخت ہوجاتا ہے اور بڑی دشواری سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تناؤ رہنے سے بھی ہاضمہ کمزور ہوجاتا ہے اور آنتوں کی حرکت میں کمی آجاتی ہے، جس کی وجہ سے قبض ہوتا ہے۔

اگر حمل کے دوران قبض کا علاج نہ کیا جائے تو کچھ حاملہ عورتوں میں شدید پیٹ درد، بواسیر جیسی شکایت بھی ہوسکتی ہے۔

دوران حمل قبض کے لیے درج ذیل اصولوں پر عمل کریں:

تیز دست آور دواؤں کے استعمال سے پرہیز کریں۔

غذا میں ریشہ دار چیزیں مثلاً پالک، سلاد، گاجر، کرم کلہ وغیر کھلائیں۔ حاملہ کو 30-25 گرم روزانہ ریشہ دار غذا ہر دن استعمال کرنا چاہیے تاکہ قبض نہ ہونے پائے۔

آرام زیادہ نہ کریں بلکہ برابر ہاتھ پیر چلائیں۔ حمل کے زمانہ میں معتدل ورزش کرنے سے بھی قبض میں فائدہ ہوتا ہے، ریاضت کرنے سے آنتوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے جس سے قبض نہیں ہونے پاتا۔

پانی خوب پئیں، حاملہ کو ایک دن میں تقریباً 12 آونس پانی پینا چاہیے تاکہ پاخانہ خشک نہ ہونے پائے۔

دن میں پانچ سے چھ بار تھوڑا تھوڑا کھانا چاہیے، تاکہ ہضم کے لیے معدہ پر ایک وقت میں زیادہ بوجھ نہ ہو اور کھانا معدہ سے آنتوں میں آسانی سے جاتا رہے۔

بطور علاج سونے سے پہلے ایک چمچ روغن بادام یا روغن زیتون ایک چمچہ پلائیں۔

مربہ ہلیلہ ایک عدد روزانہ کھلائیں۔

گلقند 3 گرام سوتے وقت لیں۔

اگر شدید قبض ہو تو روغن ارنڈ آدھا چمچا دودھ میں گھول کر پلائیں۔

5 عدد منقے سوتے وقت کھائیں۔

آدھا گلاس گنگنے پانی میں آدھا لیموں نچوڑ کر دن میں دو بار پینے سے قبض میں فائدہ ہوتا ہے۔ لیموں میں کثیر مقدار میں وٹامن سی پایا جاتا ہے۔ وٹامن سی ایک اچھا Antioxidant ہے۔ یہ اجزا جسم میں صفرا کی پیدائش کو بڑھاتے ہیں صفرا آنتوں کی حرکت دودیہ (Peristaltic Movement) کو بڑھاتا ہے، جس سے قبض میں فائدہ ہوتا ہے۔

دو چمچ اسبغول کی بھوسی کو ایک کپ پانی میں گھول کر پینا بھی قبض میں مفید ہے۔

دوران حمل ملین دواؤں (Laxatives) کے زیادہ استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ Laxatives کا زیادہ استعمال بعض اوقات آنتوں میں سکڑن کے ساتھ ساتھ، تشنج میں بھی سکڑن ہونے لگتی ہے۔ جو کہ حاملہ کے لیے مضر ہوسکتا ہے۔

□□□

Dr. Ehsan Rauf

476/6C Behind Madeh Ganj

Police Chowki, Sitapur Raod

Lucknow-226020 (U.P)

ہم کیوں پہنیں زیورات؟

ایس اے ساگر

یوں تو زیورات پہننے کی تاریخ 100,000 سال قدیم بتائی جاتی ہے لیکن جدید دور نے خواتین کو مردانہ پن کی طرف ایسا دھکیلا ہے کہ انھیں زیورات تو درکنار ہاتھوں میں چوڑیاں، کان میں بندے اور ناک میں لونگ پہننا گویا عار بن گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب پاؤں میں پازیب کی غیر موجودگی خواتین کو سخت گراں گزرتی تھی۔ انگلیوں میں انگوٹھی پہننے کا رواج اتنا عام تھا کہ منگنی کا تصور انگوٹھی کے بغیر مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا جبکہ دور حاضر میں تحائف نے انقلاب برپا کر دیا ہے اور زیورات کا استعمال اپنی کشش کھوتا جارہا ہے۔ بازار میں بکنے والے زیورات گھروں میں تجوریوں کی زینت بنتے ہیں یا پھر تقریبات میں شان بگھارنے کا ذریعہ قرار پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ زیور صرف جسمانی زینت بڑھانے اور حسن میں چار چاند لگانے کے ہی کام آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیورات خواہ سونے کے ہوں یا چاندی کے، سیپ کے ہوں یا شیشے کے ہوں یا پھولوں کے زیور حسن کی افزائش کے ساتھ ساتھ صحت کے ضامن بھی ہوتے ہیں۔ ان سے نہ صرف خواتین کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ بہت سے امراض سے جسم کی حفاظت کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ پتھروں سے مزین زیورات پہننے سے کسی طرح کا نقصان نہیں ہوتا لہٰذا پریشانی اور ستاروں کو اپنے حق میں مہربان بنانے کے لیے، نیلم، یاقوت، زمرد، ہیرا، موتی وغیرہ استعمال کرنا چاہیے۔ جدید سائنس کے مطابق بھی ناک میں ننھی یا لونگ پہننے سے پھیپھڑوں میں پہنچنے والی ہوا فلٹر ہوجاتی ہے۔ اس طرح دھول، مٹی یا گرد نیز باریک کیڑے مکوڑے سانس کے راستے پھیپھڑوں تک نہیں پہنچ پاتے بلکہ پھیپھڑوں تک صاف ستھری ہوا پہنچتی ہے۔ صاف ہوا بدن کو ملنے کی وجہ سے گندہ خون اچھی طرح صاف ہوجاتا ہے۔ یہی صاف خون دل تک پہنچتا ہے، جس کی وجہ سے انسانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ناک میں زیور پہننے کی وجہ سے ذہانت کو فروغ دینے والے جراثیم کو بھی تقویت ملتی ہے۔ اس طرح کان کا زیور کان میں داخل ہونے والی ہوا کو مضر اثرات سے پاک کر کے اسے اپنے میں جذب کر لیتا ہے اور سماعت سے تعلق رکھنے والی نسوں کو صاف رکھنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہاتھوں کے زیورات مستقل طور پر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ یہ ٹھنڈک قلبی سکون میں معاون اور مددگار ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہاتھوں میں پہنے ہوئے زیورات آنکھوں کی روشنی میں اضافہ کرتے ہیں اور جسمانی توانائی میں اضافے کا موجب ہوتے ہیں۔ ماتھے پر استعمال ہونے والے زیورات جلد سے چپکے رہنے کی وجہ سے پسینہ بہانے والے باریک باریک سوراخوں کو صاف کرتے ہیں اور جسم کی چمک دمک بڑھانے میں بھی مددگار ہوتے ہیں۔ علم جیوتش کے مطابق ستاروں کی مناسبت سے انگوٹھیوں کے پہننے کا رواج بہت قدیم ہے۔ عہد رفتہ سے آج کے سائنسی دور تک انگوٹھیاں پہنی اور پسند کی جاتی ہیں اور ستاروں کے نحس اثرات ختم کرنے کے لیے انھیں خاص قسم کے پتھروں سے سجا کر خصوصیت کے ساتھ پہنا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں پہننے سے زہر کا اثر تیزی سے اپنا کام نہیں کر پاتا اور زہر کی جان لیوا رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے۔ اس سست رفتاری کی وجہ سے پہننے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اسے اپنی زندگی کے دفاع کا مزید موقع مل جاتا ہے بلکہ بروقت علاج سے کبھی جان بھی بچ جاتی ہے۔ زیورات کے ذریعے خاندان

میں افرادی وسعت بھی ممکن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سارے نگوں میں ہیرا سب سے افضل ہے لیکن اولاد کے خواہش مند اسے کبھی نہ پہنیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس خاتون کو اولاد نہیں چاہیے اسے ہیرا پہننا چاہیے۔ ان مقبول عام نگوں کی افادیت اور کمیابی کی وجہ سے ہمیشہ ان میں ہیرا پھیری ہوتی رہی ہے۔ اس لیے ان کی پہچان کے ماہرین نے مختلف طرح کے استعمال مقرر کیے ہیں۔ نگوں کی آزمائش کے لیے راجہ بھوج نے بڑے بڑے تجربات تحریر کیے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ جو ہیرا پانی میں تیر سکے، شدید ضرب برداشت کر سکے، پہلودار ہو، قوس قزح کی شکل کا ہو، ہلکا ہو، چکنا ہو اور آب دار ہو وہ سب سے بہتر ہوتا ہے۔ نگوں کے زیورات کے علاوہ موتی بھی صحت کے لیے بہت فائدے مند ثابت ہوتے ہیں۔ موتی کے لمس سے جسم میں ٹھنڈک اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ آنکھ، دل اور دوسرے اعضا کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن موتی مصنوعی بھی بنائے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی پہچان بھی ضروری ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اصلی موتی سیپ سے پیدا ہوتے ہیں لیکن سیپ میں بنے موتی نقلی موتیوں کی نسبت صاف اور چمکیلے ہوتے ہیں۔ ہاتھی دانت سے بنائے ہوئے موتی یا بادلوں کے ذریعہ پیدا ہونے والے موتی نہایت عمدہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ سونے کے زیورات جسمانی دھاتوں کی کمی کو دور کرنے، جسم کو تقویت دینے، آنکھوں کی بینائی کے لیے مفید اور زہر کے اثرات کو ضائع کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہاتھ لگا کر دیکھیں تو شیشہ یا کانچ ہمیشہ ٹھنڈا محسوس کریں گے۔ کانچ کی چوڑیاں یا دیگر زیورات جسم کو مضر حرارت سے بچا کر ٹھنڈا رکھتے ہیں۔ مختلف رنگوں کی بہار نہ صرف آنکھوں کو لبھاتی ہے بلکہ پہننے والے کے موڈ کو بھی ٹھیک رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سیپ کی چوڑیاں جسم میں کیلشیم کی کمی کو پورا کرتی ہیں۔ ان کے پہننے سے خون اور پتے کے امراض کا خدشہ کم رہتا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیورات یعنی ہیرا، سونا، چاندی، موتی، نگ وغیرہ تو اب خواب کی باتیں ہیں۔ آج کل یہ پیسے والوں کا کھیل ہے۔ عام لوگوں کا سنگھار تو اب ہڈی، پلاسٹک اور دوسری معمولی دھاتوں کے زیورات ہیں لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ زیورات کا مطلب ہڈی یا پلاسٹک وغیرہ کی اشیا تک محدود نہیں ہے۔ ایسے زیورات جو جسمانی افادیت رکھتے ہیں وہ معمول سے مختلف تو ہوں گے ہی۔ پھولوں سے بھی سنگھار کیا جاتا ہے۔ پھولوں کو بطور زیور بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں پھولوں کے زیورات کا رواج بہت زیادہ تھا۔ ہار، گجرے اور دوسرے کئی طرح کے پھولوں کے زیورات پہننے کا دستور تھا۔ پھولوں کا جسم پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ کنول کے پھول پہننے سے جسم ٹھنڈا رہتا ہے۔ بدن میں پھوڑے پھنسی وغیرہ ہونے کی صورت میں نہ صرف پہننے والے کو آرام ملتا ہے بلکہ مرض کی افزائش میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ جسم پر زہر کا اثر کم ہوتا ہے۔ گلاب، بیلا، جوہی وغیرہ کے زیورات فرحت بخش ہوتے ہیں۔ ان کے استعمال سے موٹاپا کم ہوتا ہے۔ چمپا، چنبیلی، موگرے وغیرہ کے زیورات استعمال کرنے سے جسمانی کمزوری اور خون کی خرابیاں دور ہو جاتی ہیں اور دل بھی خوش رہتا ہے۔

☐☐☐

تاثرات: نگر نگر سے

'خواتین دنیا' اگست 2018 ایک دوست کے ذریعے پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ رسالہ خواتین کی نشوونما کا بہت عمدہ ذریعہ ہے۔ اس شمارہ کا کور پیج جاذب نظر ہے، جس پر ہندوستان کے چند خاص اور مشہور خواتین کی تصاویر ہیں۔ مجھے لگتا ہے خواتین ناول وافسانہ نگار کے ساتھ جس طرح جھانسی کی رانی کو شامل کیا گیا ہے اسی طرح پی۔ وی۔ سندھو، سائنا نہوال جیسی خواتین کو بھی شامل کیا جانا چاہیے اور ساتھ ہی ان کے حوالے سے مضمون بھی شامل ہونا چاہیے تاکہ ان خواتین کے کارناموں سے لاعلم لوگوں کے علم میں اضافہ ہوسکے۔

اس کے علاوہ ترنم جمال کی کہانی 'لگاؤ' مجھے بے حد پسند آئی۔ حقیقت پرمبنی یہ افسانہ کمال کا ہے۔ جس میں غریب کے بچے کن چیزوں سے محروم رہتے ہیں اور امیر کے بچوں کے پاس کیا کیا سہولیات ہوتی ہیں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ غریب اور امیر کے فرق کو واضح کرتے ہوئے مصنف نے ہمارے سماج میں نابرابری کے آئینہ کو عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ لہٰذا مجھے اگلے ماہنامہ کا بے صبری سے انتظار ہے۔ امید ہے کہ آنے والا شمارہ اور بھی بہتر اور شاندار ہوگا۔

تبسم ہاشمی، 1806، احمد منزل، دریا گنج، دہلی

خواتین دنیا شمارہ اگست 2018 پہلی مرتبہ میری بیٹی کے ذریعے مجھ تک پہنچا۔ رسالہ خواتین دنیا نسوانی زندگی کا محرک لگتا ہے اس کی فہرست جس میں اول صفحہ 'روبرو' کے نام سے اردو کی مشہور افسانہ نگار حجاب امتیاز علی سے شمیم حنفی کی گفتگو' اور پھر جہان نسواں میں موجود بھی مضامین خواتین کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً قومی پرچم کی خالق ثریا طیب جی، مسلم خواتین اور تحریک آزادی، خواتین کی اختیارکاری قابل غور ہیں جو بلاشبہ خواتین کو فکروعمل کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ حسن سخن، باورچی خانہ، صحت اور آرائش وزیبائش کالم نسوانی زندگی کے اہم موضوعات ہیں۔ یہ رسالہ مجھے بے حد پسند آیا اور اس لیے میری طرف سے قومی کونسل کو دلی مبارک باد۔

عذرا شاہین، کوچہ چالان، نئی دہلی

'خواتین دنیا' اردو ادب میں نیا ہے لیکن کم وقت میں ہی اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اگر ہم اس کی وجہ جاننے کی کوشش کریں تو ہم پائیں گے کہ عورت کا ہمارے ملک میں مقام تو دیوی کا ہے لیکن ہمارا سماج اسے عورت ماننے کو تیار نہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ جب وہ انسان ہے تو کیا بہتر ہو کہ پہلے اسے انسان ہی سمجھ لیا جائے۔ دیوی کا مرتبہ ہم بعد میں طے کرلیں گے۔

روز بروز ہونے والی بدعنوانیاں، زنا بالجبر اور استحصال یہ سب عام باتیں ہیں۔ کیا ہم تصور کرسکتے ہیں کہ یہ سب اس ملک میں دھڑلے سے ہوتا رہتا ہے جہاں عورت کو دیوی مانا جاتا ہے۔ آج بھی نہ جانے کتنی عورتیں گھریلو تشدد کی شکار ہیں اور انصاف کے لیے در در پھر رہی ہیں۔ اس طرح کے مضامین کا احاطہ 'خواتین دنیا' نے کرنے کی ممکن کوشش کی ہے اور آگے بھی

women empowerment کے میدان میں خواتین دنیا سے امیدیں وابستہ رہیں گی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ یہ رسالہ خواتین کے لیے بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین معاشرے کو بنانے میں تعاون کرے گا۔ انہی رسالوں کے پیش نظر اردو ادب میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی اور پروین شاکر وغیرہ نے فکشن اور شاعری میں بلند مرتبہ حاصل کیا علاوہ ازیں تحریک نسواں کو اوج کمال پر پہنچانے میں نمایاں رول ادا کیا۔

نازمین بدایونی، ریسرچ اسکالر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خواتین دنیا کا شمارہ اکتوبر پڑھنے کا موقع ملا ماہنامہ کے کور پیج کو دیکھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ ہندوستان کی عظیم شخصیات کی تصاویر اور ورق کے رنگ کا انتخاب بھی خوب ہے۔ بلاشبہ ترتیب و تزئین کمال کی ہے علاوہ ازیں جہاں نسواں میں نذر سجاد حیدر یلدرم کے ناول اختر النساء بیگم کا تنقیدی جائزہ پڑھا۔ یہ مضمون قابل تعریف ہے مصنفہ نے ایمانداری اور محنت سے لکھا ہے۔ اس ناول کے ذریعے سماج میں عورت کی حیثیت، تعلیم نسواں، تہذیب نسواں کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ میری طرف سے مصنفہ کو مبارک باد۔ ساتھ ہی شمارے کی کہانیاں بھی عمدہ ہیں خاص طور پر 'عید کا چاند' کہانی مجھے پسند آئی۔ زندگی کی کڑوی حقیقت بیان کرتی ہوئی حوصلہ دلانے والی کہانی ہے۔ اس کے علاوہ رسالے کے دیگر معلوماتی مضامین کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ معیاری و دلچسپ بھی ہیں۔ نسوانی ادب کا تعارف کراتا ہوا ماہنامہ 'خواتین دنیا' باعث فخر ہے اور میری دعا ہے کہ یہ رسالہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔

حمیرا خاتون، دہلی

ماہ اکتوبر 2018 کا 'خواتین دنیا'' نظر نواز ہوا۔ خوبصورت سرورق پر ملک کی تین بڑی شخصیات مہاتما گاندھی، سرسید اور ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی تصویر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ خوشی اس بات کی کہ ماہ اکتوبر گاندھی جی کی پیدائش کے ساتھ ہی ملک کی دو عظیم شخصیت کی بھی پیدائش کا مہینہ ہے۔ یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی اپنے ملک کی خدمات میں صرف کیں اور اپنے ملک کو علم و ادبی، سیاسی و سماجی، معاشرتی و اقتصادی ہر اعتبار سے خوب سے خوب تر بنانے میں اپنا خون جگر صرف کیا۔ یہ شمارہ بالخصوص گاندھی جی اور بالعموم سرسید احمد خاں اور ابوالکلام کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ مذکورہ شخصیت سے متعلق تمام مضامین معیاری، معلوماتی اور دلچسپی کے حامل ہیں۔

'خواتین دنیا' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے خواتین کے خیالات و جذبات کو بہترین انداز میں پیش کرنے کا ایک ایسا پلیٹ فارم عطا کرتا ہے جہاں مشہور و معروف خواتین کی تخلیقات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں اور نوجوان خواتین کی تحریروں کو بھی سراہا جاتا ہے۔ نیز ان کی دلچسپی کے متعلق مواد شائع کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نسیم بانو کا مضمون 'اکتوبر کی تین بڑی شخصیات' قابل غور ہے اور مجھے کافی پسند بھی آیا نسیم بانو نے شخصیات کے ذریعے ملک کے تئیں خدمات کو پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ شمارے میں شامل دیگر مضامین، نظم و نثر اپنی اہمیت و افادیت کے سبب خوبصورت، دلکش، معلوماتی ہیں اور علم و ادب کی دنیا میں خوشگوار اضافے کا باعث بھی ہیں۔

اسما، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خواتین دنیا کا تازہ شمارہ اکتوبر 2018 موصول ہوا۔ رسالے کی آرائش و زیبائش پر کشش اور جاذب نظر ہے۔ رسالے کا پہلا مضمون مہاتما گاندھی کی شخصیت پر ہے۔ جویریہ قاضی نے اس مضمون کو کافی محنت سے لکھا ہے جس میں مہاتما گاندھی کی شخصیت کے کئی پہلو ہم پر واضح ہوئے ہیں۔ تسنیم بانو کا مضمون 'اکتوبر کی تین بڑی شخصیات' کے عنوان سے ہے۔ رہبر ملک و ملت سرسید احمد خاں کے بارے میں انھوں نے کافی معلومات یکجا کی ہیں اور اس کو ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ بابائے وطن موہن داس کرم چند گاندھی کی شخصیت کے کچھ پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی مضمون میں آگے فخر ہندوستان اے پی جے عبدالکلام کے بارے میں انھوں نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ شگفتہ یاسمین نے اپنے مضمون 'اختر النساء بیگم کا تنقیدی جائزہ' میں اختر النساء بیگم کا جو کہ نذر سجاد حیدر کا ناول ہے، کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ امریتا کماری کا مضمون بھی ہمیں گاندھی جی کے حصول مقصد کی طرف گامزن کرتا ہے گاندھی جی نے دنیا کے لوگوں کو اہنسا کا سبق دیا تھا۔ ان کے اس مضمون سے ہمیں گاندھی جی کے خیالات کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے۔ فرحت زیبا کا مضمون' گاندھی جی کا مذہبی و اخلاقی تصور' گاندھی جی کے مذہب اور اخلاق کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی شخصیت چونکہ ہمارے لیے ایک مشعل راہ ہے اس لیے اس شمارے کے زیادہ تر مضامین ان کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

خواتین دنیا میں شامل افسانوں کا انتخاب بھی لاجواب ہے۔ شاعرات کے منتخب اشعار کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔ علاوہ ازیں باورچی خانہ کی ترکیب بھی لاجواب ہے۔ آرائش و زیبائش سے متعلق موضوع بھی خواتین کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔

مسرت، نئی دہلی

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

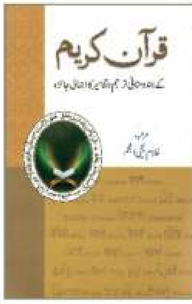

قرآن کریم کے ہندوستانی تراجم وتفاسیر کا اجمالی جائزہ

مرتب: غلام یحییٰ انجم

صفحات: 604

قیمت: 260 روپے

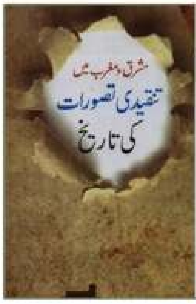

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن

صفحات: 373

قیمت: 168 روپے

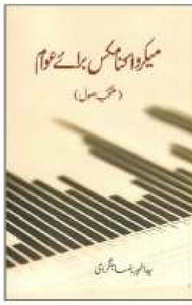

میکرو اکنامکس برائے عوام

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی

صفحات: 196

قیمت: 110 روپے

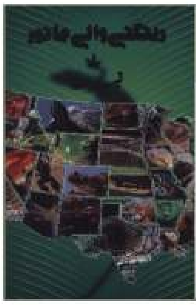

رینگنے والے جانور

مصنف: قیصر سرمست

صفحات: 84

قیمت: 22 روپے

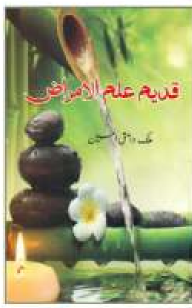

قدیم علم الامراض

مصنف: ملک وامق امین

صفحات: 131

قیمت: 50 روپے

گیلیلیو کی کہانی ان کی زبانی

مصنف: انیس الحسن صدیقی

صفحات: 37

قیمت: 40 روپے

یہ جسم وجان

مصنف: انصار احمد معروفی

صفحات: 51

قیمت: 20 روپے

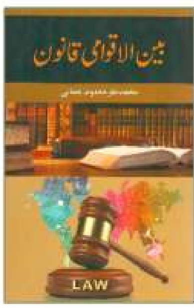

بین الاقوامی قانون

مصنف: محمد ظفر محفوظ نعمانی

صفحات: 264

قیمت: 135 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly November 2018, Vol. 02, Issue: 11 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025